ڈاکٹر محمد حمید اللہ

عہدِ نبویؐ میں نظامِ تشریع وعدلیہ

خطباتِ بہاولپور۔ خطبہ نمبر:۱۰

ڈاکٹر محمد حمید اللہ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

زیرِ نظر مضمون "عہدِ نبویؐ میں نظامِ تشریع و عدلیہ" دراصل اس سلسلے کا دسواں لیکچر ہے جو ۱۹۸۰ میں ڈاکٹر محمد حمید اللہ (مرحوم) نے اسلامیہ یونیورسٹی بہاولپور میں مسلسل بارہ روز متعدد اسلامی موضوعات پر دیے تھے جو خطباتِ بہاولپور کے نام سے شائع ہوں چکے ہیں۔

فہرست

کچھ مصنف کے بارے میں

ڈاکٹر محمد حمید اللہ صاحب 1908ء کو علوم اسلامیہ کے گہوارے حیدر آباد دکن میں پیدا ہوئے۔ آپ نے جامعہ عثمانیہ سے ایم۔اے، ایل ایل۔بی کی ڈگریاں حاصل کیں۔ اعلیٰ تعلیم و تحقیق کے لیے یورپ پہنچے۔ بون یونیورسٹی (جرمنی) سے اسلام کے بین الاقوامی قانون پر تحقیقی مقالہ لکھ کر ڈی فل کی ڈگری حاصل کی اور سوربون یونیورسٹی (پیرس) سے عہد نبوی اور خلافت راشدہ میں اسلامی سفارت کاری پر مقالہ لکھ کر ڈاکٹر آف لیٹرز کی سند پائی۔ ڈاکٹر صاحب کچھ عرصے تک جامعہ عثمانیہ حیدر آباد میں پروفیسر رہے۔ یورپ جانے کے بعد جرمنی اور فرانس کی یونیورسٹیوں میں بھی تدریسی خدمات انجام دیں۔ فرانس کے نیشنل سنٹر آف سائنٹفک ریسرچ سے تقریباً بیس سال تک وابستہ رہے۔ علاوہ ازیں یورپ اور ایشیا کی کئی یونیورسٹیوں میں آپ کے توسیعی خطبات کا سلسلہ بھی جاری رہا۔

ڈاکٹر صاحب السنہ شرقیہ اردو فارسی عربی اور ترکی کے علاوہ انگریزی فرانسیسی جرمن اطالوی وغیرہ زبانوں پر بھی عبور رکھتے تھے۔ چنانچہ مختلف اقوام و ادیان کے تاریخی اور تقابلی مطالعے کی بدولت آپ کے مقالات اور تصانیف کا علمی و تحقیقی مرتبہ نہایت بلند ہے۔ فرانسیسی زبان میں آپ کے ترجمہ قرآن مجید اور اسی زبان میں دو جلدوں پر مشتمل سیرت پاک کو قبول عام حاصل ہوا۔ عالمی شہرت یافتہ کتاب Muhammad Rasul Allah کے مصنف ہیں۔اس کے علاوہ

The Battlefields of Prophet Muhammad

The Muslim Conduct Stare

The First Written Constitution

الوثائق السیاسیہ العہد النبوی و الخلافۃ الراشدہ

خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

علاوہ ازیں علم حدیث کے سلسلے میں ڈاکٹر صاحب کا اہم ترین کارنامہ "صحیفہ ہمام بن منبہ" کی تحقیق و اشاعت ہے۔ یہ قدیم ترین مجموعہ احادیث ہے جو عہدِ صحابہ میں مرتب ہوا تھا۔ آپ نے اس نادر و نایاب ذخیرہ حدیث کا ایک مخطوطہ برلن میں دریافت کیا اور اسے جدید اسلوب تدوین کے مطابق مرتب کر کے شائع کرایا۔ خدمت قرآن کے سلسلے میں آپ نے پچپن برس قبل تراجم قرآن حکیم کی ببلیو گرافی "القرآن فی کل لسان" مرتب کی جس میں دنیا بھر کی ایک سو بیس زبانوں میں قرآن کے تراجم کا تذکرہ اور بطور نمونہ سورہ فاتحہ کے تراجم درج ہیں۔

تو یہ ہے اس شخص کا مختصر تعارف جس نے مغرب کی نئی نسل کو اسلام سے قریب تر کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ جو تقریباً نصف صدی سے زائد علم کے موتی لٹاتا رہا، جو زندگی کی آخری سانس تک فاطمہ کے بابا کے عشق میں سلگتا رہا۔۔۔جلتا رہا۔۔۔جلاتا رہا

خدا اس پر رحمتیں نچھاور کرے۔

محترم صدر! محترم وائس چانسلر! محترم سامعین!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ!

آج کا مضمون دو ایسے موضوعوں سے متعلق ہے، جن میں بے شمار باتیں تشریح طلب ہیں۔ ظاہر ہے کہ ان سب پر ایک مختصر تقریر میں جیسی روشنی چاہیئے، نہیں ڈالی جاسکتی۔ آج کے لیکچر میں دو مسئلوں پر خصوصی بحث کرنی ہے۔ ایک "قانون سازی" اور دوسرے "عدلیہ" جس کی غرض کے لیے قانون سازی ہوتی ہے۔ جہاں تک قانون سازی کا تعلق ہے، دو تمہیدی باتیں ذہن میں رکھنے کی ضرورت ہے۔ اول یہ کہ قانون دو طرح سے بنتا ہے۔ ایک یہ کہ نامعلوم زمانے میں سے رسم ورواج کی صورت میں کوئی قاعدہ چلا آرہا ہو، اور ہمیں بالکل معلوم نہ ہو کہ اس کا بنانے والا کون تھا؟ وہ کتنے عرصے سے چلا آرہا ہے؟ اور اس کی تاریخ کیا کہہ رہی ہے؟ دوسری قسم قانون کی وہ ہے، جسے معلوم المصنف کہہ لیں۔ یعنی اس کے بنانے والے کا ہمیں پتا ہوتا ہے، مثلاً کوئی بادشاہ، کوئی حکمران جو ایک قاعدہ اپنے ماتحت لوگوں کے لیے مقرر کرتا ہے اور وہ اس کی تعمیل کرتے ہیں۔ کبھی اسے ایک معلوم انسان ہی پیش کرتا ہے، لیکن یہ کہتے ہوئے کہ یہ میرا بنایا ہوا قانون نہیں بلکہ خدا کے احکام ہیں۔ مگر ان میں بنیادی فرق یہ ہے کہ رسم ورواج کے متعلق ہمیں معلوم نہیں ہوتا کہ وہ قانون کیسے بنا؟ ممکن ہے اس کا کوئی جزء تو ایسا ہو، جو خدائی احکام کے طور پر، کسی پیغمبر کے ذریعے ہم تک پہنچا ہو جیسے ہم فراموش کر گئے ہوں اور وہ عمل ہماری عادت بن گیا ہو اور بطور نتیجہ اس عمل کو ہم نے جاری رکھا ہو۔ قانون اصل میں دو طرح کے ہیں۔ ایک خالص انسانی قانون اور دوسرا خدائی قانون۔ ایک تمہیدی مگر اہم بات یہ کہ قانون بن جانے کے بعد اس کو ایک مماثل درجے کا اقتدار رکھنے والی مماثل شخصیت ہی بدل سکتی ہے۔ اس کی مثال یوں دی جاسکتی ہے کہ یونیورسٹی کا ایک پروفیسر اپنی جماعت کے اندر ایک حکم دے تو طالب علم یا دفتر کا ادنٰی ملازم اس کو بدل نہیں سکتا۔ البتہ وائس چانسلر اسے بدل سکتا ہے یا وائس چانسلر سے بھی بڑی شخصیت وزیر تعلیم یا ملک کا حکمران اسے بدل سکتا ہے۔ لیکن بنانے والے سے کمتر مرتبے کا شخص نہیں بدل سکتا۔ اس قاعدے اور اصل کے اثرات بہت دوررس ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اگر کوئی قانون اللہ کی طرف سے نازل ہوا ہو تو اس کو بدلنے والا اللہ ہی ہو سکتا ہے۔ خدا سے کم تر مرتبے کا کوئی فرد اس کو بدلنے کا اختیار نہیں رکھتا اور اگر بدلے تو وہ ملحد ہو گا اللہ کو نہ مانتا ہو گا۔ اللہ کے بعد پیغمبر اپنے ذاتی اجتہاد سے کوئی قانون بنا سکتا ہے جبکہ اسے وحی نہ آئی ہو اور وہ اپنی صوابدید اور ملکۂ استدلال سے حکم دیتا ہے تو اب اس قانون کو کوئی پیغمبر ہی بدل سکتا ہے۔ پیغمبر سے کم تر درجے کی کوئی شخصیت

مثلاً کوئی بادشاہ کوئی مجتہد کوئی فقیہ اس کو بدلنے کی قابلیت نہیں رکھتا۔ البتہ اللہ کی ذات پیغمبر کے حکم کو بدل یا منسوخ کر سکتی ہے۔ یعنی قانون قانون بدلنے کا بھی کا بھی ایک معیار ہے۔ مثال یوں دی جا سکتی ہے کہ اگر توریت میں کوئی حکم ہو تو انجیل یا قرآن مجید اسے بدل سکتے ہیں۔ کیونکہ وہ بھی اللہ کے احکام کا مجموعہ ہیں اسی طرح حضرت موسیٰؑ اور حضرت عیسیٰؑ کے اقوال کو حضرت محمد ﷺ کے اقوال سے بدل سکتے ہیں۔ غرض پیغمبروں کے احکام کو یا تو اللہ کی ذات بدلے گی یا کوئی اور پیغمبر ہی وحی کے ذریعے سے بدل سکے گا۔

اس پس منظر میں اب ہم یہ دیکھیں گے کہ اسلامی قانون کس طرح بنتا ہے؟ جہاں تک اسلام کی تاریخ کا تعلق ہے تو ہم جانتے ہیں کہ عہدِ نبویؐ غارِ حرا میں پہلی وحی کہ تاریخ سے لے کر حضور ﷺ کی وفات تک تیئس سال کے عرصے پر مشتمل رہا اور یہ کہ اسلام کا اساسی ماخذ یعنی قرآن مجید ایک دم نازل نہیں ہوا۔ وہ کتابی صورت میں یا تختیوں پر لکھے ہوئے، حضرت موسیٰؑ کے قانون کی طرح ہم تک نہیں پہنچا بلکہ تیئس سال کے عرصے میں وقتاً فوقتاً نازل ہونے والی آیات کی صورت میں امت تک پہنچایا گیا۔ ان حالات میں بہت ہی سادہ اور بدیہی بات ہے کہ غارِ حرا میں جس وقت پہلی وحی یعنی سورۃ اقراء (96: 1-5) کی ابتدائی پانچ آیات نازل ہوئیں، اس وقت اسلامی قانون موجود نہیں تھا۔ قرآن مجید یا حدیث میں جو احکام آئے وہ رفتہ رفتہ بعد میں آئے۔ سوال یہ ہے کہ اسلام کی ابتداء میں اسلامی قانون کیا تھا؟ قرآنی اشارات کی بنا پر اور تاریخ عہدِ نبوت کی روشنی میں ہم پورے ادب کے ساتھ بیان کر سکتے ہیں کہ شہر مکہ کے جو بھی رسم و رواج تھے، وحی کی غیر موجودگی میں وہی مسلمانوں کا قانون تھا اور وہ اس پر عمل کرتے رہے۔ مثلاً شراب کی ممانعت ہجرت کے کئی سال بعد نازل ہوئی۔ ان آیات کا شانِ نزول یہ ہے کہ ایک دن ایک صحابی نے شراب پی لی تھی۔ وہ نشے کی حالت میں تھے کہ نماز پڑھائی تو سورہ: "قل یا یہا الکفرون" کی آیات اس طرح پڑھ ڈالیں، جس سے معنی الٹ گئے اور جو چیز ناگفتنی تھی وہ ان کی زبان سے نکل گئی۔ تو اس سلسلے میں قرآن مجید کی وہ آیات نازل ہوئیں، جن میں شراب پینے کو حرام قرار دیا گیا۔ دوسرے الفاظ میں یہ حکم آنے تک شراب کا پینا واجب تو نہیں جائز تھا۔ رسول اللہ ﷺ نے خود تو کبھی شراب نہیں پی، لیکن کچھ صحابہ اس سے ضرور دل بہلائی کرتے رہے۔ یہی حال اور سارے احکام کا ہے۔ پہلی وحی میں اگرچہ بت پرستی کی ممانعت کی گئی تھی لیکن اور احکام و ممانعت کا اس میں کوئی ذکر نہیں ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ بعض ممنوعات کی عقل بھی متقاضی ہے۔ مثلاً چوری نہیں کرنی چاہیئے، کسی بے قصور کو جان سے نہیں مارنا چاہیئے، کسی کو دھوکہ نہیں دینا چاہیئے۔ انسانی فطرت اور عقل بھی ان کو نامناسب سمجھتی ہے۔ ان کی ممانعت تو جاری رہ سکتی ہے لیکن جن چیزوں کے متعلق انسانی رائے میں اختلاف ہو سکتا ہے، مثلاً شراب پینا، سور کا گوشت کھانا، ان پر اگر اہل مکہ عمل کرتے رہے ہوں اور اس کی ممانعت ابھی تک نہ

آئی ہو تو مسلمانوں کے لیے اس پر عمل کرنا، جائز قرار دیا جائے گا۔ وہ اسلامی قانون ہی ہو گا، اگرچہ عارضی اور قابلِ تبدیلی قانون ہو، لیکن بہر حال اسلامی قانون ہی ہو گا۔ وحی اور قرآن کی بحث کے ضمن میں ایک اور چیز کا ذکر کرنا ناگزیر ہے، جسے اصول فقہ کی کتابوں میں " شرائع من قبلنا" کا نام دیا گیا ہے، یعنی اسلام سے قبل کے صحف سماوی۔ ان کا ذکر قرآن مجید میں کئی بار آیا ہے۔ سب سے اہم صراحت سورہ انعام (۶: ۸۳ تا ۹۰) میں ہے جہاں کوئی بیس پیغمبروں کے نام لینے کے بعد آنحضرت ﷺ کو حکم دیا گیا ہے۔ "اولئک الذین ھدی اللہ فبھدا ھم اقتداہ" (یعنی مذکورہ بالا لوگ وہ ہیں جن کو خدا ہی نے صحیح راستہ بتایا ہے۔ اس لیے (اے محمدؐ) تو ابھی انہی کے رستے کی اقتدا کر)۔ نتیجہ یہ ہے کہ اگر پرانی خدائی کتاب ہم تک پہنچے، اور اس کی صحت کا اطمینان ہو ، اور اس کتاب کے احکام کو قرآن نے یعنی خدا نے بعد میں منسوخ بھی نہ کیا ہو تو وہ پرانے نبی کی وحی مسلمانوں پر بھی واجب لا تعمیل رہے گی، کیونکہ وہ خدا ہی کے حکم پر مشتمل تھی۔ اور خدا کا حکم اگر خدا ہی نہ بدلے تو وہ بر قرار رہے گا۔ ہمارے فقہاء نے ایسی بہت سی مثالیں دی ہیں۔ چند کا ذکر کرتا ہوں جن سے مفہوم آپ پر واضح ہو جائے گا۔ چنانچہ سورہ مائدہ (۵: ۴۵) میں خدا فرماتا ہے: "ہم نے یہودیوں کے لیے توریت میں حکم دیا ہے کہ جان کے بدلے جان، آنکھ کے بدلے آنکھ۔۔۔" صراحت سے یہ توریت کا اور یہودیوں سے مختص قانون ہونے کے باوجود اسلامی قانون کا جزء بن جاتا ہے۔ ایک دوسری مثال سورہ نور (۲۴: ۲) ہے جہاں غیر شادی شدہ زناکار مرد اور عورت کو ایک سو درے یا کوڑے مارنے کا حکم ہے، لیکن شادی شدہ لوگوں کی سزا کا قرآن میں کوئی ذکر نہیں ہے۔ اس کی وجہ یہ سمجھ میں آتی ہے کہ ایسے (شادی شدہ) لوگوں کی زناکاری پر توریت اور انجیل دونوں میں رجم کرنے کا حکم موجود ہے (اور صحیح بخاری وغیرہ کے مطابق رسول اکرم ﷺ نے اس کی صحت کی توثیق بھی فرمائی ہے)۔ لہذا جس توریتی اور انجیلی حکم سے قرآن نے سکوت کیا وہ بر قرار رہے گا۔ چنانچہ اسلام میں بھی رجم کے حکم کو رسول اکرم ﷺ اور بعد کے سارے خلفاء اور فقہاء نے بر قرار سمجھا اور نافذ کیا۔ غرض " شرائع من قبلنا" بھی اسلامی قانون کا ایک ماخذ ہیں بشرطیکہ ان کی صحت کا ثبوت ملے اور قرآن و حدیث نے ان کو بدلنے کا حکم نہ دیا ہو۔

اسلامی قانون کا دوسرا ماخذ حدیث و سنت ہیں اور وہ قیامت تک بر قرار تو رہتے ہیں لیکن ان کا بننا اور بدل سکنا ایک محدود زمانے یعنی رسول اکرم ﷺ کی زندگی میں وقوع میں آتا ہے۔ رسول اکرم ﷺ کے دنیا سے تشریف لے جانے کے بعد ان کے بننے اور بدلنے کا زمانہ ختم ہو جاتا ہے۔ وہ ہمارے پاس محفوظ رہتے ہیں۔ اس کے بعد، ان میں تبدیلی غیر ممکن ہو جاتی ہے۔ اس مختصر صحبت میں یہ تو ممکن نہیں کہ تفصیل کے ساتھ بتاؤں کہ قرآن و سنت میں کون سا قانون پہلے آیا، پھر تیئس سال کے عرصے میں اس میں کیا تبدیلی اور اضافے ہوئے۔ لیکن مجموعی طور پر ہم یہ پیش نظر رکھیں گے کہ قرآن مجید کے ذریعے سے جو احکام آئے، وہ

خدائی حکم کے طور پر ہمارے پاس آئے، اور اس میں تبدیلی اور تو اور خود پیغمبر بھی ذاتی رائے سے نہیں کر سکتا۔ اس طرح سنت کے ذریعے سے جو احکام ہم تک پہنچتے رہے، ان کی دو قسمیں ہیں۔ ایک قسم یہ ہے کہ وحی و الہام کے ذریعے سے رسول اللہ ﷺ تک پہنچے ہیں اور اس شرط یا اس صراحت کے ساتھ کہ انہیں قرآن میں داخل نہ کیا جائے۔ جیسا کہ قرآن مجید میں صراحت کے ساتھ ذکر ہے "وماینطق عن الھوی ان ھوالاوحی یوحیٰ" (۵۳: ۳-۴) (پیغمبر جو چیز بھی بیان کرتا ہے۔ وہ اپنی ذاتی خواہش کی وجہ سے نہیں ہوتا ہے بلکہ خدا ہی کی وحی ہوتی ہے۔ جو اس تک پہنچائی جاتی ہے)۔ تو اگر پیغمبر کی بیان کردہ چیزیں قرآن میں داخل نہ کی گئی ہوں، تو مسلمانوں کا عقیدہ یہی ہوتا ہے کہ وہ الہام کے ذریعے پیغمبر تک پہنچی ہیں اور پیغمبر نے پوری دیانت داری سے ہم تک پہنچائی ہیں۔ لیکن یہ بھی ممکن ہے کہ کسی مسئلے میں احکام کی ضرورت ہو، قرآن میں وہ احکام ہمیں نہ ملتے ہوں، اور وحی کا انتظار ہو، مگر وحی آتی نہیں تو ان حالات میں اگر معاملہ ایسا ہے کہ جس میں انتظار کیا جا سکتا ہے تو رسول اللہ ﷺ انتظار کرتے ہیں۔ لیکن معاملہ فوری ہو تو وہ مجبور ہوتے ہیں کہ اجتہاد و استنباط کر کے، استدلال کر کے، اپنی صوابدید سے کوئی حکم دیں۔ ایسے حکم کی دو صورتیں ہوں گی۔ یا تو خدا اس کی توثیق کر دے گا یا خدا اس کو نامناسب سمجھے تو تبدیلی کا حکم دے گا۔ اس بارے میں ایک معقول تصور یہ بھی ہے کہ اگر خدا کو رسول کا استنباط نامناسب معلوم نہ ہو تو توثیق سکوت کے ذریعے سے بھی ہو سکتی ہے، اور وحی کے ذریعے صراحت کے ساتھ بھی۔ یہ فوری بھی ہو سکتا ہے اور اس میں دیر بھی ہو سکتی ہے۔ اگر خدا کی طرف سے ترمیم کا کوئی حکم نہ آئے تو چاہے کتنی ہی مدت گزر جائے، رسول اللہ ﷺ اس بات کے مجاز ہوں گے کہ اس پر عمل کرتے رہیں کیونکہ اس کی تبدیلی کا خدا نے حکم نہیں دیا۔ پیغمبر کے استدلال و استنباط میں تبدیلی کے لیے خدا کا حکم آنا ضروری ہے۔ چنانچہ ایسی مثالیں قرآن مجید میں ملتی ہیں مثلاً جنگ بدر کے قیدیوں کے ساتھ کیا برتاؤ کیا جائے، اس بارے میں کوئی صریح حکم اس وقت تک نہیں آیا تھا۔ رسول اللہ ﷺ نے فدیہ لے کر ان کو رہا کرنے کا فیصلہ کیا تو فوراً ہی خدا کی طرف سے وہ مشہور آیت تنبیہ نازل ہوئی: " لَّوۡلَا كِتَٰبٞ مِّنَ ٱللَّهِ سَبَقَ لَمَسَّكُمۡ فِيمَآ أَخَذۡتُمۡ عَذَابٌ عَظِيمٞ " (۸: ۶۸) (اگر اللہ اس سے پہلے ہی فیصلے نہ کر چکا ہوتا تو اس چیز کی بنا پر جو تم نے حاصل کی ہے (یعنی مالِ فدیہ) تمہیں سخت عذاب دیا جاتا)۔ یہاں ہم دیکھتے ہیں کہ اللہ یہ بھی وضاحت کر دیتا ہے کہ رسول کا انسانی حیثیت میں استنباط اسے پسند نہیں آیا، البتہ اس خاص صورت میں، جو میں بیان کر رہا ہوں، اس کے متعلق خدا یہ وضاحت بھی کر دیتا ہے کہ "میں پہلے ہی سے طے کر چکا تھا کہ اپنے پرانے (توریت) کے قانون کو امتِ محمدیہ کے لیے بدل دوں۔ لہٰذا اب میں محمد رسول اللہ ﷺ کے فیصلے کو قبول کرتا اور اس کی توثیق کرتا ہوں، تم اس پر عمل کر سکتے ہو۔" اس کے برعکس رسول کرم ﷺ کے استنباط کردہ حکم کی قرآن کے ذریعے سے یا وحی کے ذریعے سے فوراً تنسیخ ہو گئی تو ایسی تنسیخ کی بنا پر رسول اللہ ﷺ کے حکم کا اطلاق نہیں کیا جائے گا۔ غرض جہاں تک اسلامی قانون کے بنیادی اساسی ماخذوں کا تعلق ہے، پہلی چیز ملک کا

رسم ورواج ہے۔ جو معقولیت کے منافی نہ ہو اور جس میں اس وقت تک قرآن و سنت کے ذریعے سے تبدیلی نہ کی گئی ہو۔ دوسرا ماخذ قانون، وضع کردہ قانون یعنی صراحت کے ساتھ کسی قاعدے کا مقرر کرنا ہے، اور یہ قرآن کے ذریعے سے بھی ہو سکتا ہے، سنت کے ذریعے سے بھی۔ ان دونوں میں ایک اساسی فرق یہ ہے کہ قرآن اللہ کا حکم سمجھا جائے گا اور سنت کے سلسلے میں ہم مختلف وجوہ سے کوئی حکم سنیں تو اس کا درجہ بالکل قرآن کے برابر ہو گا۔ مثلاً اگر عہد، نبوی میں رسول اللہ ﷺ سے کوئی شخص یہ کہتا کہ یہ قرآن ہے، اللہ کا حکم، میں اس کی تعمیل کرتا ہوں۔ اور یہ آپ کا انسانی حکم ہے، میں اس کی تعمیل نہیں کرتا۔ ظاہر ہے ایسے شخص کو فوراً ملت سے خارج کر دیا جائے گا۔ جس وجہ سے حدیث کی حیثیت کچھ کم ہو جاتی ہے۔ وہ یہ ہے کہ قرآن کی تدوین و تحفظ اور ایک نسل سے دوسری نسل تک پہنچانے کا انتظام رسول اللہ ﷺ نے خود اپنی نگرانی میں کرایا۔ اور اس کے ایک ایک حرف کو اپنے حکم کے ذریعے سے امت تک پہنچایا۔ جہاں تک حدیث کا تعلق ہے، اس کا زیادہ حصہ ایسا ہے جو صحابہ نے اپنی صوابدید سے لکھا، یہ بھی ممکن ہے کہ صحابہ کی انفرادی قابلیتوں کے اختلاف کے باعث ایک صحابی رسول اللہ ﷺ کی بات کو اچھی طرح سمجھتا ہے اور دوسرا کسی نہ کسی وجہ سے، مثلاً یہ کہ وہ عالم و فاضل نہیں ہے یا یہ کہ وہ ان پڑھ ہے بدوی ہے یا عین اس وقت کسی کے چھینک سے اس نے کوئی لفظ نہیں سنا، اور کسی ایک بنیادی اہم لفظ کے نہ سننے کی وجہ سے اس حدیث کے صحیح مفہوم کو سمجھنے سے قاصر رہا۔ اگر بعد میں وہ کوئی روایت کرتا ہے تو وہ حدیث کی صحیح روایت نہ ہو گی چنانچہ قرآن جس کی تدوین رسول اللہ ﷺ نے اپنی نگرانی میں کرائی، اور حدیث، جو صحابہ نے ذاتی صلاحیتوں کے مطابق انفرادی طور پر مرتب کی، دونوں میں فرق ہو گا۔ اس لیے بعد کے زمانے میں کسی حدیث پر عمل کرنے کے متعلق بہت سے سوالات پیدا ہو جاتے ہیں کہ آیا یہ ابتدائی حکم ہے یا آخر تک یہی قانون رہا۔ شروع میں ایک حکم دینے کے بعد اسے منسوخ تو نہیں کر دیا؟ آیا یہ حکم کسی مخصوص شخص کے لیے تھا یا وہ سارے لوگوں کے لیے ہے؟ اس حدیث کو صحابی نے صحیح طور پر سنا اور صحیح طور پر لکھا یا ان کی انفرادی صلاحیتوں کی وجہ سے اس میں کچھ فرق بھی پیدا ہو گیا ہے؟ صحابہ کے بعد تابعین کی روایات سے مختلف زمانوں میں صحت حدیث پر کوئی اثر تو نہیں پڑا؟ انہی وجوہ سے حدیث کا درجہ قرآن کریم سے کم تر ضرور ہے لیکن اس کا جو اصل اصول ہے وہ مین آپ سے بیان کر چکا ہوں، کہ رسول کے حکم کو صرف رسول ہی بدل سکتا ہے۔ رسول سے کمتر درجے کی شخصیت کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ کوئی تبدیلی کرے۔ ضمناً میں یہ بھی عرض کر دوں کہ حدیثوں کی صحت معلوم کرنے کے لیے بہت سے وسائل ہیں۔ ہمارے اسلاف نے بہت سے اصول مدون و مرتب کر کے، ہمیں حدیثوں کے جانچنے کا معیار دیا ہے کہ کون سی حدیث قابل اعتماد ہے؟ اگر دو حدیثوں میں اختلاف ہے تو کس کو ترجیح دی جائے؟ واضح رہے کہ میرا یہ منشاء ہرگز نہیں ہے حدیثوں پر اعتماد نہ کیا جائے۔ کیونکہ "صحاح ستہ" جیسی حدیث کی کتابوں کے متعلق ہمیں یہ اطمینان ہے کہ ان کی تدوین، انسانی حد تک، صحت کے تمام اصول و شرائط کے مطابق ہوئی ہے۔ لہٰذا احادیث کی کم ترین درجے کی

کتاب کو بھی میں پورے اعتماد کے ساتھ دوسری قوموں کی مستند ترین کتابوں پر ترجیح دوں گا۔مثال کے طور پر انجیل کو لیجئے۔ انجیل جو آج کل چار انجیلوں کی شکل میں ہم تک پہنچی ہے۔ اس کے متعلق خود عیسائی مؤرخ بیان کرتے ہیں کہ حضرت عیسیٰؑ کے دنیا سے تشریف لے جانے کے تین سو سال بعد پہلی مرتبہ اس کا ذکر ملتا ہے۔ان تین صدیوں مین نسلاً بعد نسل اس کو کس طرح نقل کیا گیا اور ایک نسل سے دوسری نسل تک کس طرح پہنچایا گیا؟ اس کا قطعاً ہمیں کوئی علم نہیں ہے۔اس کے بر خلاف حدیث کی ادنیٰ ترین کتاب میں ایک ایک سطر والی حدیث کے متعلق بھی پوری تفصیل سے حوالے (Refrences) ملتے ہیں: فلاں نے فلاں سے سنا، اس نے فلاں سے، اس نے فلاں سے ،اس طرح حوالوں کا یہ سلسلہ بالآخر رسول اللہ ﷺ تک پہنچتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔ لہٰذا اتنے حوالوں کی موجودگی میں حدیث کی ادنیٰ ترین کتاب بھی دوسری قوموں کی اعلیٰ ترین کتابوں کے مقابلے میں زیادہ بلند درجہ رکھتی ہے۔

احکام کے بارے یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ سارے احکام یکساں درجے کا حکم نہیں رکھتے۔ بعض کی حیثیت فرض یا واجب کی ہوگی، بعض کا حکم سفارش اور مستحب کا ہوگا۔ بعض کی صورت حرام کی ہوگی، یعنی ہرگز نہیں کرنا چاہیئے۔ بعض کی ممانعت ایسی ہوگی کہ نہ کرو تو بہتر ہے، وہ مکروہ سمجھے جائیں گے۔ اور بہت سی چیزوں کے متعلق یہ حیثیت ہوگی کہ وہ ہماری صوابدید پر چھوڑی گئی ہیں یعنی مباح ہیں، چاہے تو کریں، چاہے نہ کریں۔ مگر یہ تصور کسی قدر دیر سے پیدا ہوا کہ علمی نقطہ نظر سے احکام کو پانچ قسموں میں تقسیم کیا جائے اور یہ تقسیم اخلاقی اساس پر ہوگی۔ جو چیز خیر ہے، اچھی ہے، بہتر ہے اسے ضرور کرنا چاہیئے۔ جو چیز شر ہے، بری ہے، اسے ہرگز نہیں کرنا چاہیئے۔ جس چیز میں خیر غالب ہے لیکن اس میں شر کا بھی عنصر پایا جاتا ہے اس کا کرنا بہتر ہے لیکن واجب نہیں ہوگا، اس کے بر خلاف جس میں شر کا غلبہ ہے اگرچہ خیر کا بھی کچھ عنصر پایا جاتا ہے اس کا نہ کرنا بہتر ہے، اسے مکروہ کہا جائے گا۔ اور جن چیزوں میں یہ صورت نہیں ہے، اور نہ خیر ہے نہ شر ہے یا اس میں دونوں برابر ہیں، اس کو ہم مباح قرار دیں گے۔ یہ پنج گانہ تقسیم غالباً دوسری صدی ہجری میں شروع ہوئی اور جیسا کہ امام غزالیؒ نے بیان کیا ہے، یہ معتزلہ اصول فقہ کی کتابوں میں ہمیں پہلی مرتبہ ملتی ہے۔ اس سلسلے میں قطع کلام کے طور پر ایک چھوٹی بات عرض کرون گا کہ بھلائی اور برائی کے لیے قرآن میں دو اصطلاحیں آئی ہیں، جو دلچسپ ہیں اور شاید ضرورت ہے کہ اس کی تھوڑی سی تحلیل بھی کی جائے۔ اچھی چیز کو قرآن "معروف" کہتا ہے اور بری چیز کو "منکر" کہتا ہے، "امر بالمعروف ، نھی عن المنکر"۔ کہیں کہیں خیر اور شر کا لفظ بھی آیا ہے۔ لیکن عام طور پر خیر کی جگہ "معروف" کا لفظ اور "شر" کی جگہ منکر کا لفظ مستعمل ہے۔ "معروف" کے لفظی معنی ہیں وہ چیز جو سب لوگ جانتے ہوں اور "منکر" وہ چیز جو بالکل نہیں جانی جاتی"۔ بہت دنوں تک میں سوچتا رہا کہ یہ اصطلاح اس معنی کے لیے کیوں استعمال

ہوئی؟ ہر وہ چیز جو معقول ہے۔ جسے عقل انسانی قبول کرتی ہے اور ہر شخص اس کے بارے جانتا ہے کہ وہ اچھی ہے، اسی کا حکم دیا جائے گا، اور جس چیز کو ہر شخص جانتا ہے کہ وہ بری ہے، اسے ممنوع قرار دیا جائے گا۔ یہ ان دونوں اصطلاحوں (معروف و منکر) کی وجہ تسمیہ ہے۔ ویسے ہمارا خالق و مالک جو حکم چاہے دے سکتا ہے۔ البتہ وہ حکیم ہے، بری چیز کا کبھی حکم نہیں دیتا۔ اس کا ہر حکم حکیمانہ اور اچھا ہی ہو گا، چاہے انسان کسی حکم کی حکمت کو سمجھے یا نہ سمجھے۔

عہدِ نبویؐ میں کچھ اور بھی ماخذ قانون ملتے ہیں، ان کا ذکر کرنے سے پہلے میں عرض کروں گا کہ قرآن اور حدیث، ابدی ماخذِ قانون ہیں۔ چونکہ حضرت خاتم النبیین ﷺ کے بعد رسالت و نبوت کا سلسلہ ختم ہو چکا ہے لہٰذا آپؐ کا لایا ہوا قانون یعنی قرآنی قانون قیامت تک نافذ رہے گا۔ اسی طرح پیغمبر کے حکم کو منسوخ کرنے کے لیے ایک نئے پیغمبر کی ضرورت ہو گی، اس کے نہ آسکنے کی بنا پر حدیث و سنت بھی ابدی بن جائیں گے اور قیامت تک ان پر عمل کرنا ہمارے لیے واجب ہو جائے گا۔ کتاب و سنت میں بعض چیزین مستحب ہیں، بعض حرام ہیں اور بعض مکروہ ہیں۔ محض امر کا صیغہ استعمال کرنے سے وہ ایک درجہ میں نہیں پہنچ جاتیں۔ مثلاً قرآن مجید میں زکوٰۃ دینے کا حکم ہے، جو فرض ہے۔ اور قرآن میں اسی صیغے کے ذریعے حکم آئے گا کہ خیرات کرو، ظاہر ہے کہ یہ فرض نہیں بلکہ اس کی ترغیب دلائی جاتی ہے۔

عہدِ نبویؐ میں بعض اور ماخذہائے قوانین بھی ہمیں ملتے ہیں جو مؤقتی اور عارضی ہیں۔ ان میں سے ایک چیز وہ ہے جس کو ہم "معاہدہ" کا نام دیتے ہیں۔ اور مسلمان اگر کسی معاہدے میں کچھ شرطیں قبول کرتے ہیں، تو وہ شرطیں مسلمانوں کے لیے واجب التعمیل ہوں گی لیکن اس وقت تک جب تک کہ وہ معاہدہ بر قرار ہے۔ جیسے ہی وہ معاہدہ ختم ہو جائے یا وہ منسوخ کر دیا جائے تو وہ شرطیں بھی جو ہمارے قانون کا جزو بن چکی تھیں منسوخ ہو جاتی ہیں۔ اسی طرح معاہدے کے ذریعے قبول کی ہوئی شرطوں کو اسلامی قانون کا عارضی اور مؤقتی جزء سمجھا جائے گا۔ اگرچہ اس کی تعمیل اتنی ہی ضروری ہے جتنی ان احکام کی، جو ابدی طور پر قیامت تک کے لیے قرآن وحدیث میں دیے گئے ہیں۔ اس کی مثالیں ملتی ہیں۔ صلح حدیبیہ میں رسول اللہ ﷺ نے یہ شرط منظور فرمائی تھی کہ اگر کوئی مسلمان مشرکینِ مکہ کے ہاں پناہ گزیں ہو جائے تو اس کا مسلمانوں کے سپرد یا تحویل کیا جانا مشرکینِ مکہ کے لیے ضروری نہیں ہو گا۔ اس کے برخلاف اگر مشرکین کا کوئی شخص مسلمان ہو کر بھی رسول اکرم ﷺ کے پاس پناہ کے لیے آتا ہے تو اس معاہدے میں رسول اکرم ﷺ کا فریضہ قرار دیا گیا تھا کہ اس شخص کو مکے والوں کے مطالبے پر واپس کر دیں۔ اگرچہ یہ ایک یکطرفہ کاروائی تھی لیکن جب تک وہ معاہدہ برقرار رہا، وہ قاعدہ اسلامی قانون کا جزو رہا۔ جیسے ہی وہ معاہدہ دو سال بعد ختم ہوا، ان میں وہ قانون بھی، وہ شرطیں بھی خود بخود ختم ہو گئیں۔

ایک اور ماخذِ قانون یہ ہے کہ بعض وقت نیا قانون بنانے کی جگہ اسلامی حکومت اس چیز کو قبول کر لیتی ہے جو کسی اجنبی ملک میں رائج ہو۔ اس ضمن میں جو مثال اس وقت میرے ذہن میں ہے وہ حضرت عمرؓ کے خلافت کے زمانے کی ہے، یعنی رسول اللہ ﷺ کی وفات کے بمشکل تین چار سال بعد کا واقعہ ہے۔ شام کی شمالی سرحد پر منبج نامی ایک مقام تھا۔ وہاں کے مسلمان والی نے حضرت عمرؓ کو لکھ بھیجا کہ سرحد پار کے لوگ ہمارے ہاں تجارت کے لیے آنا چاہتے ہیں ان کے ساتھ چنگی کے متعلق کیا برتاؤ کیا جائے؟ اور کس شرح اور کس مقدار سے ان سے چنگی لی جائے؟ حضرت عمرؓ نے جواب بھیجا کہ "ان تاجروں سے اسی شرح سے چنگی لو، جس شرح سے ان کے ملک میں مسلمان تاجروں سے لی جاتی ہے"۔ اس قاعدے کی مزید تشریح و توضیح امام محمد شیبانی، جو امام ابو حنیفہ کے شاگردِ رشید تھے، اپنی کتاب میں لکھتے ہیں کہ اس قاعدے کا اطلاق مختلف طور پر ہو سکتا ہے۔ مثلاً کسی اجنبی ملک میں اگر مسلمان تاجروں سے کوئی چنگی نہیں لی جاتی تو ہم بھی اس ملک کے تاجروں سے کوئی چنگی نہیں لیں گے۔ مماثلت (Reciprocity) کا یہ قاعدہ اس وقت تک اپنی جگہ برقرار رہے گا، جب تک ہماری حکومت اس کے خلاف فیصلہ صادر نہ کرے۔

ان ماخذہائے قانون کے بعد قابلِ ذکر چیز وہ ہے جس کے باعث اسلامی قانون ساز کو ایسا وسیلہ حاصل ہو گیا جس سے اسلامی قانون قیامت تک زندہ رہ سکے، ہر آنے والی نئی ضرورت سے عہدہ برآ ہو سکے۔ یہ اجتہاد ہے۔ ہمارے فقہاء جو چار اصول بیان کرتے ہیں: قرآن، حدیث، اجماع اور قیاس، ان میں اجماع عہدِ نبویؐ میں نہیں پایا جاتا تھا۔ قیاس جس کو ہم یہاں اجتہاد کا نام دے رہے ہیں، وہ عہدِ نبویؐ میں ہی وجود میں آچکا تھا، اور یہ عہدِ نبویؐ کے آخری زمانے کا واقعہ ہے۔ ۹ ہجری یعنی وفات سے ڈیڑھ سال پہلے رسول اللہ ﷺ نے وہ حکم دیا تھا اور جن حالات میں وہ حکم دیا تھا اس کی تفصیل یہ ہے کہ رسول اکرم ﷺ نے یمن کے علاقے میں ایک صحابی کو قاضی بنا کر روانہ کیا۔ ان کا نام معاذ بن جبلؓ تھا۔ اس زمانے کا قاعدہ تھا کہ اگر کوئی شخص کسی عہدے پر مامور کیا جاتا تو جانے سے پہلے وہ آخری باریابی، آخری ملاقات کے لیے حضور ﷺ کے پاس حاضر ہوتا اور حضورؐ اسے ہدایات دیتے تھے۔ چنانچہ رسول اکرم ﷺ نے معاذ بن جبلؓ سے پوچھا: بم تحکم؟" (تم حکم کس اساس پر دیا کرو گے؟) ان کا جواب تھا: "بکتاب اللہ" (اللہ کی کتاب یعنی قرآن کے مطابق)۔ قرآن میں جو احکام ہوں گے میں ان کا نفاذ کروں گا، ان کی تعمیل کراؤں گا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "فان لم تجد؟" (اگر اس میں نہ پاؤ تو کیا کرو گے؟) تو معاذ بن جبلؓ نے فوراً کہا: "فبسنۃ رسول اللہ" یعنی رسول اللہ ﷺ کی سنت کے مطابق، اس جواب کو بھی رسول اللہ ﷺ نے قبول کیا، لیکن پھر فرماتے ہیں کہ اگر تمہیں سنت میں بھی کوئی چیز نہ ملے تو کیا کرو گے؟ تو حضرت معاذؓ کے الفاظ یہ تھے: "اجتھد برای ولا آلو

جھدا" میں اپنی رائے کے ذریعے سے (حل تلاش کرنے کی) کوشش کروں گا اور اس میں کوتاہی نہیں کروں گا۔ دوسرے الفاظ میں اپنی صوابدید سے غور کر کے، استدلال کر کے، استنباط کر کے، قیاس کر کے حکم دوں گا، اور ایسی چیز معلوم کرنے کی کوشش کروں گا، جو میری دانست مین اللہ کو پسند ہو، معقول ہو اور عدل و انصاف کے مطابق ہو۔ اس پر رسول اللہ ﷺ اس قدر خوش ہوئے کہ آسمان کی طرف ہاتھ اٹھا کر کہتے ہیں: "اے اللہ تو نے اپنے رسولؐ کے رسول کو جس چیز کی توفیق دی ہے، اس پر تیرا رسولؐ خوش ہے"۔ چنانچہ قرآن وحدیث میں سکوت کی صورت میں یا اس میں قانون نہ ملنے کی صورت میں ہمیں اجتہاد کی اجازت ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ اختیار بہت ہی محدود ہے۔ اگر قرآن حدیث میں صراحت موجود ہے تو اجتہاد کی کوئی گنجائش نہیں رہتی۔ اسی وقت اجتہاد کر سکیں گے جب کہ قرآن وحدیث میں باوجود تلاش کے کوئی قاعدہ، کوئی حکم پیشِ نظر مسئلے سے متعلق نہ ملتا ہو۔

اجتہاد کے ذریعے قانون دریافت کرنے کی بھی مختلف صورتیں ہیں۔ کبھی یوں ہوتا ہے کہ خالص اس چیز کے لیے تو حکم نہیں ہے لیکن ایک مماثل چیز کے لیے حکم ملتا ہے۔ فرض کیجیے کہ چوری کا قانون موجود ہے لیکن کفن چوری کا ذکر قرآن میں نہیں ہے کہ کیا کریں؟ اب ہمارا مجتہد قیاس کرے گا چونکہ ایک قسم کی چوری کے لیے حکم ہے تو ایک دوسری قسم کی چوری میں بھی ہم اس قسم کا استدلال کر سکتے ہیں یا اس میں کسی قدر ترمیم کے ساتھ حکم دے سکتے ہیں۔ اسی طرح اور مسائل کے متعلق بھی بعض وقت مماثلتیں ڈھونڈی جاتی ہیں۔ ایک دوسری صورت یہ ہوتی ہے کہ بظاہر تو منطقی استدلال کے ذریعے ہم ایک چیز کا حکم دے سکتے ہیں لیکن اگر ذرا غور کریں تو فوری طور پر ذہن میں آنے والا طریقہ مناسب نہیں ہوتا بلکہ ایک عمیق تروجہ سے کوئی دوسرا قانون ہی مناسب معلوم ہوتا ہے۔ اس کو استحسان کہتے ہیں کیونکہ ایک عمیق تروجہ کے باعث ہم ایک دوسرے طریقے یا قانون بہتر اور مستحسن سمجھتے ہیں۔ کبھی ایک اور اصول پیشِ نظر ہوتا ہے: وہ یہ کہ امت کا فائدہ اس میں ہے۔ بہت ہی سخت قسم کی منطق سے تو یہ قاعدہ ہونا چاہیے لیکن امت کی فلاح، امت کی بہبودی، اور آسانی کے لیے یہ دوسرا قاعدہ بہتر معلوم ہوتا ہے، اس لیے اسے استصلاح کا نام دیتے ہیں۔ اس طرح کے مختلف لطیف فروق کے ساتھ اجتہاد کی مختلف صورتیں ہوتی ہیں۔ اس کا رواج ہمیں عہدِ نبویؐ سے ملنے لگتا ہے۔ اس قاعدے کے اطلاق کے باعث، خاص طور پر قاضیوں کے فیصلوں کے سلسلے میں ہمیں ایک نئی چیز سے سابقہ پڑتا ہے، جو قانون سازی کا ایک جزء ہے۔ فرض کیجیے کہ قرآن وحدیث میں کوئی قاعدہ نہیں ملتا اور قاضی اجتہاد کر کے ایک حکم دیتا ہے۔ چونکہ وہ قاضی ہے، اس لیے وہ اپنے فیصلے کا نفاذ بھی کرا سکتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ سے پوچھنے کی ضرورت نہیں ہوگی۔ لیکن ممکن ہے کہ نفاذ سے پہلے خود قاضی کو شبہ ہو۔ وہ مرکز سے دریافت کرے گا۔ مرکز سے جواب دیا جائے گا جو سنت ہونے کے باعث قانون کی صورت اختیار کرے گا۔ اس کا تعلق اجتہاد سے نہیں رہے گا۔ ایک اور صورت یہ بھی ہو سکتی ہے کہ

قاضی نے فیصلہ کر دیا اور اس کے متعلق رسول اللہ ﷺ سے رجوع کرنا ضروری نہیں سمجھا۔ لیکن اس فیصلے کی اطلاع رسول اللہ ﷺ کو کسی نہ کسی ذریعہ سے پہنچی یا یہ کہ فریقِ مقدمہ نے اپیل کی یا رسول اللہ ﷺ نے اپنے نامہ نگاروں کے ذریعہ سے اطلاع پائی۔ اگر رسول اللہ ﷺ اس فیصلے کو نامناسب سمجھتے ہیں تو نظم ونسق کے افسرِ اعلیٰ یا حکمران کی حیثیت سے نہیں بلکہ قانون ساز کی حیثیت سے: فوراً اس قاضی یا گورنر کو ہدایت دیں گے یوں نہیں یوں کرو۔ ایسی مثالیں متعدد ملتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے مختلف گورنروں کو ایسی ہدایتیں بھیجیں۔ ایک مثال یہ ہے کہ ایک شخص کو قتل کر دیا گیا تھا۔ قتل خطا کے طور پر تھا اور اس کا خون بہا دلایا گیا۔ پرانے رواج کے مطابق خون بہا متوفی کے سب وارثوں کو نہیں بلکہ صرف مرد وارثوں کو دلایا گیا۔ اس کی اطلاع رسول اللہ ﷺ کو پہنچی تو آپ ہدایت بھیجتے ہیں کہ فلاں شخص کے خون بہا میں سے اس کی بیوہ کو بھی حصہ دلایا جائے۔ خون بہا کو وراثت کا جزء قرار دیا گیا۔ وراثت کی صور میں بیوی کے، بیٹے کے، بیٹی کے، ماں باپ وغیرہ ہر ایک وارث کے قرآن میں حصے مقرر کیے جاچکے ہیں۔ اسی لیے خون بہا میں بھی اسی قاعدے کا لحاظ رکھنا ہوگا۔ ان مثالوں سے واضح ہوتا ہے کہ قانون سازی کس طرح اس زمانے میں عمل میں آیا کرتی تھی۔

اجماع کا قاعدہ عہدِ نبویؐ میں ناممکن تھا، وہ بعد کی چیز ہے۔ اجماع کے معنی ہوتے ہیں کہ قرآن وحدیث میں اگر ہمیں کسی مسئلے کا حل نہیں ملتا تو ہم اس بارے میں قیاس واجتہاد سے کام لیتے ہیں اور اس اجتہاد پر اس زمانے کے سارے ہی علماء متفق ہو جاتے ہیں۔ ایسے قانون کو جس پر سب علماء متفق ہو جائیں، لازماً زیادہ قابلِ قبول قرار دینا پڑتا ہے۔ اجماع کو ہم ایک خاص اہمیت ضرور دیتے ہیں۔ لیکن کم از کم حنفی علماء کے نزدیک اجماع اٹل اور ناقابلِ تبدیل نہیں ہے، بلکہ ایک جدید تر اجماع کے ذریعے ایک قدیم تر اجماع کو منسوخ کیا جاسکتا ہے۔ جس طرح ایک نبی کے احکام کو دوسرا نبی منسوخ کر سکتا ہے۔ اسی طرح ایک فقیہ کی رائے کو دوسرا فقیہ رد کر کے اپنی علیحدہ رائے دے سکتا ہے۔ بنابریں اگر ایک قدیم اجماع کے بعد اس کی برعکس بات پر دوسرا جدید اجماع قائم ہو جائے تو وہ پہلے اجماع ہی کی طرح واجب التعمیل ہو جائے گا اور پرانا اجماع باقی نہیں رہے گا۔ یہ رائے ممتاز حنفی امام ابو الیسر البزدوی کی ہے۔ اصولِ فقہ پر ان کی مشہور کتاب میں ان کے الفاظ یہی ہیں کہ جدید تر اجماع کے ذریعے سے قدیم تر اجماع منسوخ کیا جاسکتا ہے۔ امام رازی کی بھی یہی رائے ہے۔ یہ اسلامی قانون کی ایک بہت بڑی خدمت تھی۔ چونکہ اجماع سے بنا ہوا قانون خدا اور رسول کی طرف سے آیا ہوا اٹل قانون نہیں، بلکہ انسانی رائے پر مبنی ہوتا ہے اس لیے اس کے ہمیشہ کے لیے پابند نہ ہو جائیں، بدلنے والے حالات کے تحت، بدلنے والی ضرورتوں کے تحت، ہم ایک انسان کے قانون کو دوسرے انسان کے قانون کے ذریعے بدل سکیں۔ ظاہر ہے کہ عام طور پر ہم یہی کہیں گے کہ اجماع کے خلاف زبان کھولنے کی جرات نہیں کی جاسکتی لیکن اس قاعدے

کے تحت جو امام بزدوی نے بیان کیا ہے اولاً کسی نہ کسی کو پرانے اجماع کے خلاف زبان کھولنی اور پرانی رائے پر اعتراض کرنے کی ضرورت پیش آئے گی۔ پھر بعد میں معاصر فقہا اس کی رائے کو قبول کرتے جائیں گے۔ جب سارے لوگ اس پر متفق ہو جائیں گے تو پرانا اجماع ختم ہو جائے گا۔

اب اپنے موضوع کے دوسرے جزء پر توجہ کرتا ہوں جو عدل گستری کے متعلق ہے۔ عہدِ نبویؐ کی عدل گستری کی اہمیت اور اس زمانے کی اصلاحات کی اہمیت کو سمجھنے کے لیے پہلے یہ معلوم کرنا ضروری ہے کہ زمانہ جاہلیت میں عدل گستری ک کیا نظام تھا؟ اس کے بعد ہم دیکھیں گے کہ عہدِ نبویؐ میں کیا انقلاب آیا، کیا کایا پلٹ ہو گئی اور اس کی کتنی بڑی اہمیت ہے؟ زمانہ جاہلیت میں عرب کے بدوی قبائل میں کوئی حکمران، کوئی حکومت نہ تھی۔ کوئی عدالت بھی نہیں ہوا کرتی تھی۔ لہٰذا کسی شخص کو انصاف حاصل کرنے کے لیے کسی کے پاس جا کر شکایت کرنے کا کوئی امکان نہیں تھا۔ مظلوم کیا کرے؟ "دست خود دہان خود" ہر شخص اپنی بساط کے مطابق ظالم سے بدلہ لے گا۔ اگر ظالم کمزور ہو تو بدلہ آسان تھا لیکن اگر ظالم قوی ہو تو کمزور کے لیے کوئی امکان نہیں تھا کہ وہ انصاف حاصل کر سکے۔ اس صورت حال میں کہیں کہیں ہمیں بہت ہی مدہم روشنی بھی نظر آتی ہے۔ وہ یہ کہ اگر ظالم منظور کرے تو کوئی خاطر مدار شخص ان دو آدمیوں کے جھگڑے کو چکائے گا۔ ایسی صورت میں اس پنچ یا ثالث کو ایک طرح کا عارضی حاکمِ عدالت بنا لیا جاتا تھا۔ اور اس کے فیصلے پر فریقین عمل کرتے۔ اس کی کچھ مثالیں زمانہ جاہلیت میں ہمیں ملتی ہیں۔ طائف کے قریب عکاظ میں ایک میلہ لگا کرتا تھا، جس میں بیرونی ممالک سے بھی لوگ آیا کرتے تھے۔ اس میلے کے لیے ایسے حکم مقرر کیے جاتے تھے جو دو تین دن کے لیے عارضی طور پر ہوتے تھے۔ جب تک میلہ لگا رہتا۔ اس وقت تک ان کی حیثیت حکم کی ہوتی۔ میلے میں جتنے تجارتی جھگڑے پیش آتے، ان کی طرف رجوع کیے جاتے اور وہ فیصلے دیتے تھے۔ ہر شخص جانتا تھا کہ کون حکم ہے، اس لیے لوگ اگر آپس میں طے کر چکے ہوں کہ اپنے مقدمے کا فیصلہ حکم سے کرائیں گے تو وہ میلے کا انتظار کرتے۔ میلے کے حکم کے پاس جاتے، اس کو اپنا قصہ سنا کر فیصلہ کراتے۔ اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ عرب میں، اس اندھیر نگری کے اندر بھی کہیں کہیں کچھ روشنی کی مثالیں ملتی ہیں۔ جہاں تک مکے کا تعلق ہے تو ہمیں وہاں شہر کے باشندوں کے جھگڑوں کو چکانے کے لیے تین چیزیں نظر آتی ہیں۔ ایک دیوانی عدالت جس کے حاکم عدالت خود حضرت ابو بکرؓ تھے۔ دوسری فوجداری عدالت، ان دونوں کے ایک علاوہ ایک اور ادارہ وہاں پایا جاتا تھا جسے حلف الفضول کا نام دیا گیا ہے Order of Chivalry کی صورت تھی۔ مکے والوں نے ایک زمانے میں یہ محسوس کیا تھا کہ ہمارے شہر میں بعض وقت اجنبیوں پر بے وجہ ظلم ہوتا ہے، جس سے شہر بھر کی بدنامی ہوتی ہے۔ چنانچہ واقعتہً ابو جہل کی وجہ سے ایک شخص نے ایک نظم کہی جس میں مکہ والوں کی ہجو کی۔ ابو جہل نے تو کوئی پرواہ نہ کی لیکن

دوسرے اہلِ مکہ کو چوٹ لگی۔ ان حالات میں انہوں نے آپس میں جمع ہو کر معاہدہ کیا کہ ہم میں سے کم از کم چند لوگوں کو چاہیئے کہ رضاکارانہ طور پر اس بات کا اقرار کریں کہ جب بھی ہمارے شہر کے اندر کسی اہلِ مکہ یا کسی اجنبی پر اگر کوئی ظلم ہو تو ہم مظلوم کی مدد کریں گے اور اس وقت تک چین نہیں لیں گے جب تک کہ اسے اس کا حق نہ دلایا جائے۔

جہاں تک مدینہ کا تعلق ہے تو وہاں سوائے اس کے کوئی امکان نہ تھا کہ ہر شخص اپنی مدد آپ کرے۔ ان حالات میں رسول اللہ ﷺ کے مدینہ تشریف لانے کے بعد جب شہری مملکت قائم ہوئی تو رسول اللہ ﷺ نے اس کا دستور مدون فرمایا اور یہ دنیا کا پہلا دستور تحریری طور پر منضبط کر کے نافذ بھی کیا۔ اس میں ایک عجیب وغریب حکم دیا گیا جسے انقلابی نوعیت کا کہا جاسکتا ہے۔ وہ یہ کہ انصاف بجائے خود انفرادی کے مرکزی شئے ہو گی۔ یعنی اگر کسی کو نقصان پہنچا ہے تو وہ براہ راست مجرم کو سزا نہیں دے گا بلکہ مرکزی عدالت سے رجوع کرے گا۔ حاکمِ عدالت حالات سن کر بغیر رعایت کے پوری غیر جانبداری کے ساتھ مقدمے کا فیصلہ کرے گا۔ اور ظالم کو سزا دے کر مظلوم کو اس کا حق دلائے گا۔ اس کے بارے میں کچھ دفعات اور بھی ہیں۔ وہ یہ کہ کسی شخص کو ظالم کی حمایت کرنے کا حق نہیں ہو گا۔ چاہے اس کا اپنا بیٹا ہی کیوں نہ ہو۔ فرض کیجئے کہ میرے بیٹے نے کسی کو قتل کر دیا ہو تو باوجود باپ ہونے کے مجھے یہ حق نہیں ہے کہ میں اپنے بیٹے کی حمایت کروں، اور پولیس کی طرف سے اس کی گرفتاری کے وقت مدافعت کروں۔ اس کے بر خلاف یہ کہا گیا ہے کہ انصاف ایک خدائی حکم ہے۔ لہٰذا ہر شخص کو چاہیئے کہ انصاف کے لیے پورا تعاون کرے۔ اور کسی ظالم کو نہ بچائے، چاہے وہ اس کا بیٹا ہی کیوں نہ ہو۔

ان حالات میں ہم دیکھتے ہیں کہ مدینے کی حد تک ایک انقلابی حکم کر دیا گیا، اور انصاف جو وہاں انفرادی کام تھا اس کو ایک مرکزی اور حکومتی چیز قرار دیا گیا۔ اس کے بعد ہمیں مدینے میں دو نئے ادارے (انسٹی ٹیوشن) قائم ہوتے اور ترقی کرتے نظر آتے ہیں، جو بعد میں سارے ملک میں پھیل جاتے ہیں۔ ایک مفتی کا انسٹی ٹیوشن ہے اور دوسرا قاضی کا۔ مفتی کا مطلب یہ ہے کہ وہ فتویٰ دے یعنی ہم اس سے قانون معلوم کریں۔ قانون کے نفاذ کی ذمہ داری اس کے فرائض میں داخل نہیں۔ دوسرا ادارہ قاضی کا ہے۔ عہدِ نبویؐ میں ہمیں قاضی بہت سے ملیں گے۔ لیکن شہر مدینہ میں مستقل قاضی کا پتا کم از کم مجھے نہیں ملتا۔ البتہ مثالیں متعدد ملتی ہیں کہ عارضی طور پر کسی ایک مقدمے کا فیصلہ کرنے کے لیے رسول اللہ ﷺ کسی صحابی کو نامزد کرتے اور کہتے کہ فریقین کے بیانات کو سن کر یا بر سرِ موقع جا کر، حالات کو دیکھ کر فیصلہ کرو۔ گویا وہ رسول اللہ ﷺ کا ہی فیصلہ ہوتا تھا، کہ رسول اللہ ﷺ کے نمائندے اور مقرر کردہ نائب نے وہ فیصلہ کیا تھا۔ اس سلسلے میں ایک چھوٹا سا دلچسپ واقعہ جو خاص اہمیت کا حامل ہے وہ حضرت عمرو بن العاصؓ کا ہے، جو مہاجرین میں بہت ذہین تھے اور قانونی نقطہ نظر سے ان کی مہارت بے انتہا تھی۔ رسول اللہ ﷺ

نے ان سے کہا کہ فلاں مقدمے میں تم فیصلہ کرو۔ وہ پوچھتے ہیں: "لیکن کس اساس پر؟" رسول اللہ ﷺ ان کے مفہوم کو سمجھ کر جواب دیتے ہیں کہ اگر تم صحیح نتیجے پر پہنچو گے تو تمہیں انصاف رسانی اور حق وعدل کی بنا پر دو ثواب ملیں گے۔ اس کے برخلاف اگر تم صحیح نتیجے پر نہ پہنچو تو اگر ناانصافی ارادۃً نہیں بلکہ اتفاقاً ہوئی ہو تو تمہاری حسنِ نیت کی وجہ سے تم کو ایک ثواب ضرور ملے گا کہ تم نے انصاف کرنا چاہا تھا، ان حالات میں ہم دیکھتے ہیں کہ قاضیوں کی آراء میں اختلاف ہوتا تھا۔ اس کا آغاز عہدِ نبویؐ ہی سے شروع ہو جاتا ہے۔ اور بعد کے زمانے میں بڑھتا جاتا ہے۔ چنانچہ امام ابو حنیفہؒ نے اپنے زمانے میں اسلامی قانون کو مدون کرنے کی جو کوشش کی تھی اور چالیس ممبروں کی ایک اکیڈمی بنائی تھی، جس نے اسلامی قانون کو مدون کیا، اس کی وجہ اور اس کا باعث یہی تھا کہ مختلف قاضیوں کے فیصلے میں تضاد ہوتا تھا۔ ایک ہی قسم کا مقدمہ ہو تو ایک قاضی "الف" فیصلہ کرتا ہے اور دوسرا قاضی اس کے بالکل برعکس "ب" فیصلہ کرتا ہے۔ چنانچہ ایک کتاب جس کا نام "رسالتہ الصحابہ" ہے، اور یہ ابن المقفع کا ایک خط ہے جو اس نے اپنے ہم عصر خلیفہ منصور کے نام لکھا تھا اور اس میں وہ تفصیل سے بیان کرتا ہے کہ امیر المومنین ہمارے زمانے میں قاضیوں کے فیصلوں میں اختلاف کے باعث بے انتہا دشواریاں پیدا ہو گئی ہیں۔ ایک ہی مسئلے پر دو قاضی مختلف فیصلہ کرتے ہیں۔ ایک قاضی کے مطابق سزائے موت دینی چاہیئے دوسرے کے مطابق اس قسم کے مقدمے میں سزائے موت نہیں دینی چاہیئے۔ اسی طرح ایک اور مقدمے میں، ایک قاضی کی رائے کے مطابق ایک خاص صورت میں طلاق پڑ چکی ہے۔ دوسرا قاضی کہتا ہے کہ طلاق نہیں ہوئی۔ غرض ہماری عزت و آبرو غیر محفوظ ہو چکی ہے۔ یہ معلوم نہیں ہوتا کہ حق کیا ہے؟ ایسی مثالیں دے کر وہ ایک تجویز پیش کرتا ہے، جو میری دانست میں نامناسب تھی اور خلیفہ منصور نے بھی اسے رد کر دیا۔ اگرچہ بظاہر وہ معقول نظر آئے گی۔ اس نے یہ تجویز پیش کی تھی کہ امیر المومنین سارے قاضیوں کے پاس احکام بھیجیں کہ اپنے فیصلوں کی نقلیں خلیفہ کے پاس اپنے اپنے دلائل کے ساتھ روانہ کیا کریں۔ اگر امیر المومنین کو اس میں کوئی نامناسب چیز نظر آئے تو وہ خود حکم دیں اور خلیفہ کا حکم بعد میں سارے قاضیوں کے لیے واجب التعمیل ہو جائے گا، اور ہمیں اختلافی نظائر سے نجات مل جائے گی۔ اور کسی مسئلے میں اختلافِ رائے ہو یا دو مختلف نظریے موجود ہوں اور قاضی کو معلوم نہ ہو سکے کہ کیا کرنا چاہیئے، تو صرف اپنی صوابدید کی بجائے امیر المومنین کے احکام کی تعمیل کر سکے گا۔ اور اس طرح سارے ملک میں قانون ہر وقت یکساں رہے گا۔ لیکن خلیفہ نے نہ صرف اس تجویز کو رد کر دیا بلکہ معلوم نہیں اس بناء پر یا کسی اور وجہ سے ابن المقفع کے قتل کرنے کا حکم صادر کر دیا۔ اور اسے سزائے موت دے دی گئی۔ بہر حال میں نے آپ سے ایک قیاس ظاہر کیا تھا کہ اسلام میں ایک طرز، روش (Tradition) یہ رہی ہے کہ عہدِ نبویؐ سے لے کر آج تک عدالت کی طرح قانون سازی بھی حکومت اور سیاست کے تحت نہیں رہی۔ اگر خلیفہ منصور اس تجویز کو قبول کر لیتا تو اس کے بعد قانون سازی سیاست اور خلیفہ کے احکام کے تابع ہو جاتی۔ خلیفہ اچھے بھی آتے ہیں اور برے بھی۔ اس طرح آئے دن قانون

بدلتے رہتے۔ ایک پرانے قانون کو نیا خلیفہ منسوخ کر دیتا۔ لیکن اگر اسلامی قانون حکومت اور سیاست کے عمل دخل سے آزاد رہے تو تمام فقہا مساوی درجہ رکھنے کے باعث ایک دوسرے پر اعتراض کر سکیں گے۔ اور اس طرح قانون صحیح تر بھی رہے گا اور ترقی پذیر بھی۔

یہ تھیں وہ چند باتیں، جن سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ عہدِ نبویؐ میں قانون سازی کا کیا طریقہ، اور عدل گستری کا کیا قاعدہ تھا؟ عہدِ نبویؐ میں صوبہ جات و اضلاع مثلاً یمن میں قاضی بھیجے جاتے اور ان کے متعلق بعض تفصیلیں بھی ملتی ہیں۔ مثلاً ابو موسیٰ الاشعری کو جب قاضی بنایا گیا تھا تو ان کا تقرر نامہ ہم تک پہنچا ہے۔ اس میں رسول اللہ ﷺ کہتے ہیں میں تمہیں فلاں غرض کے لیے مامور کرتا ہوں۔ تم اس طرح سے اپنے فرائض انجام دیا کرنا۔ اسی طرح بعض اور قاضیوں کے متعلق بھی احکامات ملتے ہیں۔ یوں ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ اس ابتدائی زمانے میں صفر سے شروع ہو کر اسلامی محکمہ قانون سازی اور اسلامی محکمہ عدل گستری کس طرح وجود میں آتے ہیں اور کس طرح بعد کی ضرورتوں کو وہ پورا کرتے ہیں جب کہ اسلامی مملکت ایک شہر کے ایک جز میں پائی جانے والی مملکتِ مدینہ پر ہی نہیں بلکہ تین براعظموں میں پھیل جاتی ہے۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

برادران کرام!خواہران محترم!السلام علیکم ورحمت اللہ وبرکاتہ!

متعدد سوالات آپ کی طرف سے آئے ہیں، اپنی بساط کے مطابق جوابات دینے کی کوشش کرتا ہوں۔

سوال ۱: **اگر قانون سازی ایک نجی مسئلہ ہے تو پھر اسلامی مملکت میں قانون سازی کا کیا طریقہ کار ہو،وضاحت فرمایئے،اور قانون سازی کون لوگ کریں گے ؟اور اجماع کے بعد اس کے نفاذ کا کیا طریقہ ہو گا؟**

جواب: ہماری روایت یہ رہی ہے کہ قانون سازی سرکاری مسئلہ نہ ہو، حکومت یا پارلیمنٹ کا مسئلہ نہ ہو، بلکہ ہر فقیہ کو کسی مسئلے کے متعلق اپنی رائے پیش کرنے کی آزادی رہے۔ حکمران سے یہ حق سلب کرنے کے باوجود کبھی کوئی دشواری پیش نہیں آئی۔ بہت ہی نادر صورتوں میں ہمارے خلفاء نے بعض احکام دیے۔ مثلاً حضرت عمرؓ نے احکام صادر کیے کہ مفتوحہ ممالک کو صرف فاتح فوج کے لیے مال غنیمت نہ سمجھا جائے بلکہ پوری امت کے لیے اور ہمیشہ کے لیے وقف قرار دیا جائے۔ اس طرح کے شاذ و نادر احکام حکومت کی طرف سے بے شک صادر ونافذ ہوتے رہے۔ لیکن عام قانون سازی کا کام ہمارے فقہا انفرادی طور پر کرتے رہے۔ میں عرض کر چکا ہوں کہ مساوی مرتبے کا کوئی فرد رائے دیتا ہے تو میرے لیے یہ جسارت اور جرات کرنا ممکن ہے ، کہ اس پر تنقید کروں اور اس کے خلاف رائے دوں۔ اس کے بر خلاف اگر حکومت کا فیصلہ ہو تو ظاہر ہے کہ مجھے تذبذب ہو گا اور بعض اوقات یہ مشکل ہو گا کہ کسی جابر حاکم کے زمانے میں اس کے فیصلے کے خلاف زبان کھولوں۔ طریقہ کیا ہو؟ وہ میں بیان کر چکا ہوں۔ ہر فقیہ اپنی رائے بتاتا ہے۔ ابتدائی زمانے میں ہمارے قاضیوں کو آزادی ہوتی تھی کہ قرآن و حدیث کے مطابق جو چاہیں فیصلہ کریں۔ اگر قرآن و حدیث میں کوئی چیز نہ ملے تو فقہا کی رائے میں سے کسی رائے کا انتخاب کریں۔ اگر ان کے سامنے ایسی کوئی چیز نہ ہو تو بطور خود اجتہاد کریں اور فیصلے صادر کریں۔ اس طرح عملاً کوئی دشواری پیش نہیں آئی۔ قانون کے نفاذ کا کیا طریقہ ہو گا؟ ہمارے حکام عدالت اپنی صوابدید پر فیصلہ کیا کرتے اور پولیس کی مدد سے اس کی تعمیل کرایا کرتے تھے۔ آیا اب بھی یہ مناسب ہے یا نہ مناسب ؟اس کے بارے میں صرف یہ کہوں گا کہ ہمارا قانون اس زمانے کے مقابلے میں جب امام ابو حنیفہ نے ایک اکیڈمی بنا کر اسلامی قانون کو مدون کرنے کی کوشش کی تھی، فقہی مذاہب کے ذریعے بہت زیادہ مفصل اور معین ہو چکا ہے۔اور کم ہی ضرورت ہو گی کہ نئی قانون سازی کی جائے (قواعد کو دفعہ وار مدون البتہ کرائیں) مثلاً حنفی قانون کیا ہے؟ ''ہدایہ''، ''قدروی''، ''مبسوط'' نامی کتابوں کو دیکھتے ہیں تو ہمیں معلوم ہو جاتا ہے کہ دوسرے مذہبوں میں کہیں کہیں جزئی طور پر اختلاف ہے۔ یہ بھی ممکن ہے اور اس

کی روایتیں بھی ملتی ہیں کہ جس ملک کا حاکم جس مذہب کا ہو، حنفی، شافعی یا مالکی، وہ اس کے مطابق حکم دے سکتا ہے کہ اس ملک کے سارے قاضی مثلاً حنفی قانون کے مطابق عمل کریں گے، چاہے ان کا اپنا مذہب کوئی دوسرا ہی کیوں نہ ہو۔ چنانچہ ابو یوسف کے متعلق لکھا ہے کہ انہوں نے عباسی خلافت کے قاضیوں کے پاس یہ احکام بھیجے تھے کہ وہ حنفی مذہب کے مطابق فیصلے کیا کریں۔ اور یاقوت لکھتا ہے کہ بعض قاضی جو معتزلی یا غیر حنفی تھے، وہ بھی مذہب سلطانی یعنی حنفی فقہ کے مطابق فیصلے کیا کرتے تھے۔

سوال نمبر ۲: **اسلامی ملک میں غیر مسلم پر اسلامی قانون نافذ ہوتا ہے تو کیا ایک غیر اسلامی مملکت میں، غیر اسلامی قانون کی پابندی ایک مسلمان پر لازم ہے؟**

جواب: سوال کا پہلا جزء غلط ہے کیونکہ اسلامی مملکت میں غیر مسلموں پر اسلامی قانون نافذ نہیں کیا جاتا۔ عہدِ نبویؐ میں قرآن مجید کے احکام کے تحت ہر مذہبی جماعت کو (عیسائیوں، یہودیوں وغیرہ) کو داخلی خود مختاری حاصل تھی، عقائد اور عبادات ہی کے متعلق نہیں بلکہ قانون وعدلیہ کے متعلق بھی۔ غیر اسلامی ممالک میں ایک مسلمان پر ایک غیر اسلامی قانون نافذ ہوگا۔ یہ نہیں ہونا چاہیے، لیکن چونکہ غیر اسلامی ممالک اس رواداری اور فراخ دلی کا اب تک مظاہرہ نہیں کر سکے جو اسلام میں ہے کہ ہر قوم کو داخلی خود مختاری دی جائے، لہٰذا اگر ہم غیر مسلم علاقے میں رہنا چاہتے ہیں تو یہ سوچ اور سمجھ کر، معلومات حاصل کر کے رہیں، کہ ہم پر وہاں یہ پابندیاں عائد ہوں گی۔ لیکن ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ مثلاً ایک فرانسیسی، ایک جرمن آج مسلمان ہو جائے تو کیا کرے؟ ظاہر ہے اگر اسے آپ ہجرت کرا کے اپنے ملک میں بلانا چاہیں تو دنیا کے کتنے ملک ہیں جو آج اس پر آمادہ ہوں کہ غیر ملک کے لوگ جب بھی چاہیں، یہاں پر بس جائیں۔ ان دشواریوں کا سوائے اس کے کیا جواب دیا جائے، "لا یکلف اللہ نفسا الا وسعھا۔۔۔" (۲: ۲۸۶) (اللہ کسی شخص کو اس بات پر مجبور نہیں کرتا جو اس کی استطاعت سے باہر ہو)۔ جس حد تک ممکن ہو وہ اسلام پر عمل کرے اور جس حد تک ممکن نہیں ہے اس پر اللہ اسے معاف کرے گا۔ لیکن یہ کوشش کرتا رہے کہ جہاں تک ممکن ہو سکے اسلامی قانون پر عمل کرے۔ مثلاً ایک فرانسیسی کے لیے، فرانس کے قانونِ وراثت پر عمل کرنا لازم ہے جو حکومت کا معین کردہ ہے۔ جو نہ انجیل کا پابند ہے نہ توریت کا قانون ہے، نہ قرآن کا قانون، بلکہ انسانوں کا بنایا ہوا قانون ہے اور کوئی شخص اس سے مستثنیٰ نہیں۔ چاہے عیسائی ہو یا بے دین کمیونسٹ، یہودی ہو یا مسلمان، جو شخص بھی فرانسیسی قومیت اختیار کرتا ہے یا پیدائشی طور پر فرانسیسی ہوتا ہے، اس کے لیے قانون کی پابندی لازمی ہے۔ اس کا حل مل سکتا ہے۔ مثلاً فرانس میں وصیت اور ہبہ کی اجازت ہے۔ اگر میں یہ معلوم کر لوں کہ میرے جو قریبی رشتہ دار ہیں، بیوی، بیٹا، بھائی وغیرہ، قرآن نے ان کے کیا احکام معین کیے ہیں اور اس کے مطابق میں وصیت یا ہبہ کر دوں تو ان کے ذریعے میں اسلامی قانون پر عمل کر سکتا ہوں، اگر عمل کرنا چاہوں۔

سوال نمبر ۳: آپ نے مماثلت کے ضمن میں چنگی کا ذکر فرمایا ہے۔ براہ کرم وضاحت کیجیے کہ کیا اسلامی مملکت میں مسلمانوں سے چنگی وصول کرنا درست ہے جب کہ اکثر علماء اس کو ناجائز قرار دیتے ہیں؟

جواب: اس بارے میں مجھے زیادہ واقفیت نہیں کہ کس بنا پر اسے ناجائز قرار دیا جاتا ہے۔ کیونکہ میرا موضوع خصوصی انٹر نیشنل لاء رہا ہے۔ چنگی کے متعلق میں نہیں جانتا کہ وہ اسلام میں ممنوع ہے۔ اس بارے میں ممکن ہے صدر محترم آپ کی تشفی کر سکیں۔ البتہ میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ چنگی عہدِ نبویؐ میں بھی تھی، خلافتِ عمرؓ میں بھی تھی۔ یہ یاد رہے کہ اور ذرائع سے مسلمانوں سے رقم حاصل کرنا، ضرورت کے وقت جائز ہے یا نہیں؟ مثلاً اگر ضرورتِ زمانہ سے زکوٰۃ کی آمدنی ہمارے لیے کافی نہ ہو، تو ہمیں بھی وسائل اختیار کرنے ہوں گے، اور ہماری رعیت کو ان حالات میں اپنی طرف سے کچھ زائد ٹیکس دینے پڑیں گے۔ آج کل ایک ایک ہوائی جہاز کی قیمت کروڑوں روپے ہونے لگی ہے۔ اب اگر ہم ہوائی جہاز رقم فراہم نہ کریں، کیونکہ زکوٰۃ کی رقم ناکافی ہے، تو ہماری زندگی ہی خطرے میں پڑ جائے گی۔ لہٰذا ہم خوش دلی کے ساتھ اپنی مدد اور حفاظت کے لیے کچھ زائد ٹیکس دینے کے لیے تیار ہو جائیں گے۔ ان حالات میں میں سمجھتا ہوں کہ اس میں کوئی عملی دشواری نہیں رہتی۔

سوال ۴: وکیل کی اسلامی نقطہ نظر سے وضاحت کیجیے۔

جواب: عہدِ نبویؐ میں آج کل کی طرح پیشہ ور وکیل نہیں پائے جاتے تھے لیکن مجھے قرآن مجید (۴: ۱۰۹) میں اس کی طرف کچھ اشارہ ملتا ہے۔ ایک آیت ہے کہ "قیامت کے دن کافروں کی طرف سے اللہ سے کون جھگڑا کرے گا؟" تو آج کل کے وکیل کو میں اصولاً اور اساساً ممنوع نہیں قرار دیتا۔ کیونکہ عام کلیہ و قاعدہ ہے جس کا ذیل آیت میں اشارہ ہے۔ احل لکم وراء ذلکم --- (۴: ۲۴) یعنی پہلے چند چیزیں بتائی گئی ہیں کہ یہ حرام ہیں۔ پھر اس کے بعد ہے، "اس کے علاوہ جتنی چیزیں ہیں، وہ تمہارے لیے حلال ہیں۔" فرض کیجیے کہ وکیل کی ممانعت نہ ہو تو ہمارے لیے جائز ہو جائے گا، چاہے وہ عہدِ نبویؐ میں غیر موجود ہو۔

سوال ۵: زکوٰۃ اور عشر کی موجودگی میں دیگر درجنوں ٹیکسوں کو بالخصوص دیہی علاقوں میں تھوپ دینا، کہاں تک اور کیونکر جائز ہے؟ مفصل وضاحت کریں۔

جواب: اگر ملک کی ضرورتیں زکوٰۃ اور عشر سے پوری نہیں ہوتیں تو اپنی مدد آپ کے تحت دین کی حفاظت کے لیے زائد رقم دینا پڑے گی۔ ورنہ وہ خودکشی ہوگی۔ اور اللہ فرماتا ہے "ولا تلقوا بایدیکم الی التھلکہ" (۲: ۱۹۵) (اپنے ہاتھوں اپنے آپ کو ہلاکت میں نہ ڈالو)۔ اس کا شانِ نزول ہمارے مفسر مالی بخل ہی بیان کرتے ہیں۔

سوال۶: **عدلیہ میں وکیل کا کردار فوجداری اور دیوانی کہاں تک درست اور مفید ہے؟**

جواب: اس کا ابھی ابھی اشارۃً جواب دے چکا ہوں۔ وکیل کا منشاء اصل میں یہ نہیں ہوتا کہ چوروں اور ڈاکوؤں کی مدد کرے۔ اس کے فرائض کی اساس یہ ہے کہ جس چیز سے اس کو خصوصی تعلق ہے، یعنی ملکی قوانین سے واقفیت، اس واقفیت سے وہ اپنے مؤکل (client) کو مدد پہنچائے اور اسے بتائے کہ قانون کی روشنی میں وہ کس حد تک اور کیا حق رکھتا ہے۔ قانونی نقطہ نظر، قانون کی ٹیکنکل باتوں کو عدالت کے سامنے واضح کرنے کے لیے وکیل کی ضرورت ہے۔ اس لیے ہم اس سے استفادہ کرتے ہیں۔ اس کا کردار یہی ہونا چاہیئے کہ حق کی تائید کرے۔ یہ نہیں کہ حق کو چھپائے اور عمداً ظالموں اور مجرموں کی مدد کرے۔

سوال۷: **کیا اسلام میں موجودہ دور کے الیکشن یعنی جمہوریت کا تصور موجود ہے جس میں انسانوں کو گنا کرتے ہیں تولا نہیں کرتے؟**

جواب: اس کا جواب میں یہ دوں گا کہ جس چیز کی ممانعت نہ ہو، وہ عام طور پر حلال اور جائز ہوتی ہے۔ عہدِ نبویؐ میں لوگوں کو گنا نہیں جاتا تھا۔ لیکن اگر ہم گنیں تو اس کی ممانعت بھی عہدِ نبویؐ میں نہیں ملتی۔ اچھے لوگوں کا انتخاب کرنا آپ کے بس میں ہے۔ محض لفاظی کرنے والے ایسے شخص کو، جس کا کردار ٹھیک نہیں ہے، اگر آپ پارلیمنٹ کا ممبر بنائیں تو اس شخص کا اتنا قصور نہیں ہو گا جتنا کہ آپ کا اپنا قصور ہو گا۔ لہٰذا آپ اپنے فرائض پر غور کریں اور ایسے لوگوں کو ووٹ دیں، جو آپ کی رائے میں اچھے کردار کے مالک ہوں۔ اس ملک کی صحیح خدمت کر سکتے ہوں۔ اور آپ کے جذبات کی بھی اچھی ترجمانی کر سکتے ہوں۔

سوال ۸: **اسلامی ممالک میں، جہاں اسلامی قوانین نافذ ہیں، کیا ان ممالک کے سربراہ خلیفہ یا امیر المومنین کہلا سکتے ہیں؟ کیا ان کی اطاعت اس صورت میں بھی ضروری ہے، اگر ان میں مسلمان حکمرانوں کے اوصاف نہ پائے جاتے ہوں؟**

جواب: میرے خیال میں زیادہ بہتر یہ ہو گا کہ ہم اپنی ذاتی چیزوں پر توجہ کریں۔ اور غیروں کے معاملات میں دخل نہ دیں، جب کہ وہ ہمارے امکان اور دسترس سے بھی باہر ہیں۔ اگر فلاں ملک کا حکمران فلاں کام کرتا ہے تو ہم اس معاملے میں کیا کر سکتے ہیں؟ اس لیے ہمیں اپنے فرائض پر توجہ کرنا زیادہ مناسب ہو گا۔ رہا یہ سوال کہ ان کو خلیفہ یا امیر المومنین کہہ سکتے ہیں یا نہیں؟ اس کا حکم قرآن وحدیث میں نہیں ہے کہ کس کو خلیفہ کہنا چاہیئے، کس کو امیر المومنین کہنا چاہیئے۔ لیکن یہ بات واضح ہے کہ ساری مسلم قوم و ملت کا جو مشترکہ اور مسلمہ سردار ہوتا ہے اسی کو ہم خلیفہ اور امیر المومنین کہتے ہیں۔ اس کے علاوہ جو علاقہ دار سردار ہوتے ہیں مثلاً شام، مصر، فلسطین وغیرہ چھوٹے چھوٹے علاقے خودمختار رہنا چاہتے ہیں تو روایت کے تحت ہم ان کو خلیفہ یعنی امیر المومنین نہیں کہتے لیکن اگر وہ کہلوانا چاہیں تو ممانعت بھی نہیں ہے۔ اور یہ دیکھنے میں آیا ہے کہ ایسے بہت سے مدعی پائے جاتے رہے ہیں۔

مثلاً ابھی دس سال پہلے کی بات ہے جب یمن میں جمہوریت قائم نہیں ہوئی تھی وہاں کا حکمران "امام" کے نام سے موسوم ہوتا تھا اور اہل ملک اسے امیر المومنین اور خلیفہ کہا کرتے تھے۔ اسی طرح مراکش کے حکمرانوں کو آج بھی خلیفہ یا امیر المومنین کا نام دیا جاتا ہے۔ اگرچہ یہ دعوے ان کی اپنی سلطنت کے حدود کے باہر تسلیم نہیں کیے جاتے۔

سوال۹: **کیا موجودہ دور کی جمہوریت اسلامی تقاضوں کو پورا کرتی ہے؟ اگر یہ جمہوریت اسلامی تصور کے عین مطابق نہیں تو اسلامی ممالک میں اس کے نفاذ سے کیا تبدیلیاں لانا ہوں گی؟ حالانکہ اسلام نے ایک جاہل آدمی اور صائب الرائے کو برابر قرار نہیں دیا۔**

جواب: اسلام میں کوئی معین طرز حکومت نہیں پایا جاتا۔ رسول اکرم ﷺ نے میری دانست میں عملاً اس بارے میں کوئی صراحت نہیں کی کہ میرے بعد کون جانشین ہو گا۔ اس کا منشاء یہ تھا کہ ہر اسلامی جماعت، ہر اسلامی گروہ اور اسلامی مملکت، اپنے زمانے کی ضرورتوں کے لحاظ سے خود کوئی حکم دے، اس طرح وہ حکم ابدی نہیں ہو گا۔ جب تک ہم چاہیں گے، وہ طریقِ حکومت رائج رہے گا اور جب ہم اسے مضر پائیں گے، اسے تبدیل بھی کر سکیں گے۔ اس کے برخلاف اگر ہمیں رسول اللہ ﷺ خود ہی معین فرما دیتے کہ بادشاہت ہونی چاہیئے یا جمہوریت یا کوئی اور نظامِ حکومت، اس طرح ہمارے ہاتھ بندھ جاتے اور قیامت تک ہم اس کی خلاف ورزی نہ کر سکتے۔ غالباً رسول اللہ ﷺ نے امت کی بہتری اسی میں پائی کہ اس بارے میں ان پر پابندی عائد نہ کی جائے۔ ان حالات میں جمہوریت بھی ہمارے لیے کارآمد ہو سکتی ہے اور بادشاہت بھی۔ کوئی تیسرا طریقِ حکومت بھی کارآمد ہو سکتا ہے۔ صرف اس بات کی ضرورت ہے کہ افسرانِ حکومت اللہ سے ڈریں۔ یہ فریضہ صرف انہی کا نہیں ہے، ہمارا اپنا بھی ہے۔ ایک مرتبہ خلیفہ مامون سے ایک شخص نے اعتراض کے طور پر کہا تھا کہ حضرت عمرؓ کے زمانے میں ایسا ہوتا تھا، تم ایسا کرتے ہو۔ اس نے ایک میٹھا سا جواب دیا کہ اگر مجھے حضرت عمرؓ کے زمانے کے عوام مل جائیں تو میں بھی ویسا ہی کروں۔

سوال۱۰: **کیا اسلامی نظامِ عدل میں اپیل کی گنجائش رکھی گئی ہے؟ مثالیں دے کر وضاحت فرمائیں۔**

جواب: عہدِ نبویؐ میں خاص صراحت کے ساتھ کوئی مثال نہیں ملتی لیکن بعد کے زمانے میں ایسی مثالیں ملتی ہیں کہ قاضی کے حکم کے خلاف یا والی کے حکم کے خلاف لوگ امیر المومنین یا خلیفہ کے پاس شکایت لے کر جاتے تھے اور بعض اوقات خلیفہ ان کی شکایت سن کر والی کے احکام یا قاضی کے احکام بدلا بھی کرتا تھا، خلیفہ کے پاس آتے ہیں اور شکایت کرتے ہیں یا امیر المومنین ہمارا گورنر یا والی بہت ظالم ہے۔ خلیفہ ظاہر داری کے طور پر خفا ہوتا ہے کہ کیسے؟ میں اس سے شخصاً واقف ہوں وہ عدل مجسم ہے تم کیسے اس کی شکایت کر سکتے ہو؟ اس پر ایک بوڑھا کسان ادب کے ساتھ ڈرتے ڈرتے آگے بڑھ کر خلیفہ کے پاس جاتا ہے اور ہاتھ جوڑ کر

عرض کرتا ہے کہ اگر وہ عدل مجسم ہے تو اس سے صرف ہمیں مستفید نہیں ہونا چاہئیے، ضرورت ہے کہ سارا ملک مستفید ہو۔ لہٰذ اس کے ٹکرے ٹکرے کر کے ہر علاقے میں ایک ایک ٹکڑا بھیج دیں۔ خلیفہ ہنس پڑا اور اسے معزول کر دیا۔

سوال ۱۱: **اجماعِ امت کے متعلق آپ نے فرمایا کہ جدید اجماع، قدیم اجماع کو ختم کر سکتا ہے، اور کوئی معین نظیر اب تک معلوم نہیں ہو سکی۔ غالباً یہ بہت ہی احتیاط کا مقام ہے۔ اجماع کا ٹوٹنا بہت سے نئے مسائل پیدا کر سکتا ہے۔ بتائیے جو لوگ اجماع کی تنسیخ کو نہیں مانتے کیا وہ درست ہیں؟**

جواب: ممکن ہے آپ کی رائے صحیح ہو۔ میں نے یہ نہیں کہا کہ ایسا کیجئے۔ میں نے کہا کہ ہمارے ایک نہایت مستند، ایک نہایت قدیم فقیہ نے جن کا حنفی مذہب میں بہت بڑا درجہ ہے، ایک اصولی قاعدہ بتایا ہے کہ اجماع بدل بھی سکتا ہے۔ قرآن و حدیث میں حکم نہ ملنے کے زمانے میں لوگوں نے اپنے اجتہاد سے، اپنی رائے سے ایک نئی بات معلوم کی، پھر دوسرے لوگ اس پر متفق ہو گئے تو وہ حکم واجب التعمیل ہو گیا۔ لیکن یہ انسانی قانون ہے۔ خدائی یا رسول اللہ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ کا قانون نہیں ہے۔ لہذا بعد کے زمانے میں مساوی درجے کے انسانوں کو ہی حق ہو گا، کہ سوچیں اور بدلے ہوئے حالات کے پیشِ نظر کوئی نئی رائے دیں۔ اس رائے پر سب لوگ متفق ہو جائیں تو یہ بھی اجماع ہی ہو گا۔ پرانے اجماع کی خلاف ورزی نہیں ہو گی۔ بلکہ یہی نیا اجماع ہو گا جس پر سب لوگ عمل کریں گے۔ اس سے کچھ دشواریاں پیش آئیں گی یا نہیں، یہ کہنا میرے لیے مشکل ہے۔ میری رائے میں اگر کوئی قانون سابقہ اجماع کی بناء پر بنا تھا اور وہ نا قابلِ عمل ہے تو اس کو نہ بدلنا میرے خیال میں زیادہ دشواریاں پیدا کر دے گا۔ سوائے اس کے کوئی چارہ نہیں کہ ہم اس قانون کو بدلیں، ایک نیا قانون بنائیں اور وہ بھی اجماع ہی کے ذریعے سے بنائیں۔ یہ بھی نہ بھلائیے کہ اجماع ہونے کا محض دعویٰ کافی نہیں، ثبوت بھی چاہئیے اور وہ آسان نہیں۔

سوال ۱۲:- **معاذ بن جبلؓ کا حضورؐ کی زندگی میں قیاس کرنا جب کہ قرآن بھی نا مکمل تھا اور دین بھی، کیا ایسا ہی اس زمانے میں بعد از تکمیلِ قرآن و دین، جائز ہے؟**

جواب: چاہے قرآن ۹ ہجری میں جب معاذ بن جبلؓ کا واقعہ پیش آیا۔ سو فیصد مکمل نہ ہو چکا ہو بلکہ ۹۰ فیصد یا ۸۰ فیصد، اسی طرح حدیث کا ۱۰۰ فیصد نہیں بلکہ ۸۰ فیصد، ۹۰ فیصد، قرآن و حدیث کا جو کچھ حصہ مکمل ہو چکا تھا، دونوں میں کچھ نہ ہو تو اجتہاد کی اجازت تھی۔ اس کا اطلاق اس وقت بھی ہو گا جب قرآن کا سو فیصد حصہ اور حدیث کا سو فیصد حصہ مکمل ہو چکا ہو، اور اس میں کسی قاضی، کسی مفتی اور کسی عالمِ فقہ کو کوئی حکم نہ ملے تو اس کا حل رسول اللہ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نے بتا دیا ہے کہ اگر کوئی چیز قرآن و حدیث میں نہ ملے اور

مشورہ کرنے کے بعد تمہارے فاضل دوست بھی نہ بتا سکیں کہ اللہ و رسول کا کیا حکم ہے تو ان حالات میں اجتہاد کرنا چاہیئے۔ اور اجتہاد کے ذریعے سے جو حکم دیا جائے اور وہ اللہ کی عنایت سے ہمارے ذہنوں میں آئے، تو اسے ہم اللہ کی مرضی کے مطابق ہی سمجھیں گے۔ کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے خود فرمایا کہ اے اللہ تیرے رسول کے رسول نے جو جواب دیا ہے اس سے تیرا رسول خوش ہے تو ہم اس اجازت کو رد نہ کریں بلکہ ہمیں اس پر خوش ہونا چاہیئے کہ خدا نے ہمیں یہ سہولت اپنے رسولؐ کے ذریعے عطا فرمائی۔ ظاہر ہے کہ قرآن یا حدیث میں کوئی حکم مل جائے تو پھر اجتہاد کی اجازت نہیں رہتی لیکن مفسروں کی فہم کے اختلاف کے باعث مختلف معنی لیے جاسکتے ہیں۔ اسی لیے حضرت عمرو بن العاصؓ کے سوال پر رسول اکرم ﷺ نے فرمایا تھا کہ مجتہد سے نا خواستہ یا نادانستہ خطا ہو تو بھی اللہ اس کو اجر دیتا ہے۔

سوال ۱۳:- **کیا اسلامی قانون کو موجودہ حالات کے مطابق ڈھالنے کی کوشش ہو رہی ہے یا نہیں؟ اگر ایسا نہیں ہو رہا تو آخر ملتِ اسلامیہ کس وقت کا انتظار کر رہی ہے؟ اور آپ جیسے قابل لوگ حکومتوں کو اس قسم کے مشورے دے کر، قانون کو موجودہ حالات کے مطابق ڈھالنے کی کوشش کیوں نہیں کرتے، جب کہ قوم یا ملت کے ہزاروں نوجوان اس کی وجہ سے اسلام سے دور جا رہے ہیں۔**

جواب: غالباً آپ کو علم ہوگا کہ دنیا میں کہیں بھی اجنبیوں کو کسی ملک کے اندرونی معاملات میں دخل دینے کی اجازت نہیں ہوتی۔ میں بطور مسلمان آپ کا بھائی ضرور ہوں لیکن آپ کی حکومت کی رعیت نہیں ہوں۔ مجھ سے آپ بطور طالب علم کے پوچھیں، حکومت بطور مشیر پوچھے، میں اپنی رائے دوں گا۔ اس سے زیادہ نہ میرے فرائض ہیں نہ میرے امکانات۔ باقی یہ کہنا کہ آج کل اسلامی قانون کے نفاذ کی کوشش نہیں ہو رہی، میری رائے میں درست نہیں۔ جہاں تک میری معلومات ہیں، کوشش ہو رہی ہے۔ کچھ چیزیں ہو چکی ہیں اور کچھ زیرِ تکمیل ہیں۔ اور بہت خوشی کی بات ہے کہ یہاں رعیت بھی وہی چیز چاہتی ہے جو حکمران چاہتا ہے۔ اور ممالک میں آپ دیکھیں گے کہ رعیت تو چاہتی ہے مگر حکمران نہیں چاہتا۔ ان کے مقابلے میں آپ کو شکر ادا کرنا چاہیئے کہ آپ کو ایسا حکمران ملا ہے جس کی یہ تمنا ہے کہ اسلامی قانون نافذ کرے۔ دوسرے ممالک میں تو لوگ علی الاعلان کہتے ہیں کہ اسلامی قانون ایک پرانا قانون ہے۔ ہمیں جدید زمانے میں، جدید چیزوں پر عمل کرنے کی ضرورت ہے، چودہ سو سال پہلے کے قانون پر عمل نہیں کرنا چاہیئے۔ ان کے مقابلے میں، میری رائے کے مطابق، آپ خوش قسمت ہیں۔

سوال ۱۴:- **آپ نے فرمایا کہ قانون سازی کو پرائیویٹ رہنا چاہیئے۔ اس صورت میں شوریٰ کے قانون کی کیا حیثیت ہوگی؟ جب**

کہ شوریٰ نظام مملکت چلارہی ہو۔ نیز اس صورت میں قوانین کے عوامی اختلاف کا کیا حل ہو سکتا ہے؟

جواب: میں صورتحال آپ کو بتا چکا ہوں کہ اس کی دو نوعیتیں ہیں۔ حکومت (حکمرانِ ملک) وزیر یا کوئی قاضی بھی کسی صحیح نتیجے پر پہنچنا چاہتا ہو اور خواہش مند ہو کہ اور لوگ بھی اسے مدد دیں تو وہ لوگوں سے مشورہ کرتا ہے۔ حضرت عمرؓ نے قاضیوں کو مشورہ دیا ہے کہ فیصلہ کرنے سے پہلے اہلِ علم سے مشورہ کرو۔ میں سمجھ نہ سکا کہ شوریٰ کے کس معنی کے متعلق آپ مجھ سے سوال کررہے ہیں؟ اور ان دونوں میں مجھے کوئی تضاد نظر نہیں آتا۔ حکومت بھی مشورہ کرے گی مثلاً اپنے وزیروں سے، اپنے پارلیمنٹ سے، اسی طرح حاکمِ عدالت بھی مشورہ کرے گا۔ اسی طرح ہم آپ اپنے پرائیویٹ معاملات میں بھی مشورہ کرتے رہے ہیں اور کرتے رہیں گے۔ خود رسولِ خدا ﷺ بھی ایسا کیا کرتے تھے۔

سوال ۱۵:- ایسی صورت میں قانون دانوں کی آراء میں اختلاف کا کیا حل ہو سکتا ہے؟

جواب: میں آپ پر واضح کرچکا ہوں کہ ان دشواریوں کا اسلام کے ابتدائی زمانے میں کوئی حل نہ تھا۔ لیکن جب سے حنفی، شافعی، مالکی قانون وغیرہ پیدا ہوگئے یعنی معین ہوگئے تو اب نئے قوانین بننے کا امکان بہت کم رہ گیا ہے مثلاً قانونِ شہادت کے سلسلے میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ صرف دعوے کی اساس پر حاکمِ عدالت کو فیصلہ کردینا چاہیئے؟ اس بارے میں حدیث، مفتیوں اور مجتہدوں کی رائے کی بناپر یہ کہہ دیا گیا کہ مدعی کو ثبوت پیش کرنا ہوگا۔ اور مدعاعلیہ اس سے انکار کرسکتا ہے، جب تک اس کے خلاف دعویٰ ثابت نہ ہوجائے۔ اس کے بعد آپ نیا قاعدہ کیا بنائیں گے؟ "البینۃ علی المدعی" کا قاعدہ ہمارے پاس مثلاً امام ابو حنیفہ نے یا امام شافعی نے دیا اور وہ موجود ہے تو ہم اس موضوع پر کوئی نیا اجتہاد کرہی نہیں سکتے۔ اگر کریں تو ہم بھی وہی رائے دیں گے۔ کسی فقیہ کی رائے سے اختلاف کرنے کی کوئی ممانعت نہیں۔ قابل قبول دلیل کے ساتھ نئی رائے دیجئے تو خود پرانا فقیہ بھی، اگر وہ زندہ ہوتو، اسے خوشی سے قبول کرلے گا۔ فرضی بحث سے فائدہ نہیں۔

سوال ۱۶:- سورۃ فاتحہ امام کے پیچھے جائز ہے یا نہیں؟ وضاحت سے بیان فرمائیے۔

جواب: غالباً آپ کو معلوم ہوگا کہ اس بارے میں آئمہ کی رائے میں اختلاف ہے، مثلاً امام شافعی کہتے ہیں کہ اس کو پڑھنا ضروری ہے۔ بعض دیگر امام مثلاً امام ابو حنیفہ فرماتے ہیں کہ اس کے پڑھنے کی ضرورت نہیں۔ اور دونوں کے پاس دلیلیں ہیں۔ ایک چھوٹی سی چیز آپ میں سے ہر شخص سمجھ سکتا ہے۔ فرض کیجئے کہ میں اس وقت جماعت میں شریک ہوتا ہوں جب کہ امام رکوع میں جارہا ہو، اور میں بھی رکوع میں فوراً چلا جاتا ہوں۔ میری نماز پوری ہوجاتی ہے تو ان حالات میں سورۃ فاتحہ کا پڑھنا واجب نہ ہوگا۔ اگر میں

انفرادی طور سے نماز پڑھوں تو بے شک واجب ہے لیکن جماعت کی نماز میں، میں کہہ سکتا ہوں کہ پڑھیں تو بہتر ہے، نہ پڑھیں تو بھی جائز ہے۔ حدیث میں آتا ہے: "لا صلوۃ الا بفاتحۃ الکتاب" کوئی نماز درست نہیں ہوگی جب تک اس میں سورۃ فاتحہ نہ پڑھی جائے۔ مگر اس کے معنی امام ابو حنیفہ یہ فرمائیں گے کہ اگر آدمی تنہا نہ پڑھ رہا ہو اور اس کا امام پڑھ لے تو وہ سب کی طرف سے پڑھنا ہوگا۔ چنانچہ ایسے واقعات پیش بھی آئے۔ بہت سے لوگ امام ابو حنیفہ کے مکان پر ہجوم کرتے اور ان کو مارنا چاہتے ہیں کہ تم اس حدیث کی خلاف ورزی کر رہے ہو۔ امام ابو حنیفہ نے ان شورشیوں سے کہا کہ تم اپنا ایک نمائندہ منتخب کر لو تا کہ اس سے بات کر سکوں، سارے لوگوں سے گفتگو ممکن نہیں۔ بے سوچے سمجھے انہوں نے منظور کر لیا۔ اور ایک شخص کو نمائندہ بنا کر بھیج دیا۔ امام ابو حنیفہ نے کہا کہ تمہیں اپنے سوال کا جواب مل گیا۔ جس طرح تم اپنی پوری جماعت کے نمائندے ہو، اسی طرح امام بھی سب مقتدیوں کا نمائندہ ہوتا ہے۔ اس طرح سے وہ لوگ جو خارجی مذہب کے تھے، چپکے سے چلے گئے اور انہوں نے کوئی فساد نہیں کیا۔ بہر حال میں دہراتا ہوں کہ اس بارے میں فقہی مذاہب میں اختلاف ہے۔ لہٰذا ہر شخص کو اپنے مذہب کے مطابق ہی عمل کرنا چاہئیے تا کہ اسے اچھا مسلمان سمجھا جا سکے۔ آپس میں لڑائی جھگڑا نہیں کرنا چاہئیے۔

سوال ۱۷:- **حضور پاک ﷺ غیب جانتے تھے یا نہیں؟**

جواب:- مجھے شخصی طور پر تو اس کا علم نہیں لیکن مسلمانوں کا عقیدہ یہ ہے کہ غیب کی جس چیز سے اللہ پیغمبر کو واقف کراتا ہے، وہ جانتے تھے۔ جو غیب کی چیز اللہ اپنے لیے مخصوص رکھتا ہے، اس کا جاننا پیغمبر کے لیے بھی ناممکن ہوتا ہے۔

سوال ۱۸:- **حضور پاک ﷺ نور تھے یا بشر؟**

جواب: اس کا جواب آسان ہے خود قرآن میں ذکر آیا ہے " إِنَّمَا أَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ "(۴۱: ۶) (میں بھی تمہارے جیسا بشر ہوں) تو قرآن پاک کی صراحت کی موجودگی میں کوئی اور جواب نہیں دیا جا سکتا۔

سوال ۱۹:- **انگوٹھا چومنا جائز ہے یا نہیں؟**

جواب: غالباً یہ سوال اس سلسلے میں کیا گیا ہے کہ جب اذان ہو رہی ہو اور محمد رسول اللہ ﷺ کا لفظ مؤذن متواتر دہراتا ہے تو بعض لوگ اپنے انگوٹھے کا ناخن چوم کر آنکھوں پر ملتے ہیں۔ اس بارے میں شخصی طور پر ابھی مجھے کسی تلاش کا موقع ملا نہیں لیکن میرے اپنے ایک استاد نے جو بہت فاضل شخص تھے، ایک بار ہم سے کہا تھا کہ اس بارے میں حدیثیں ملتی ہیں، تو میں نے اس پر

اکتفا کیا۔ اور اس میں مجھے کوئی حرج نظر نہیں آتا کیونکہ آدمی کو کسی سے عشق ہو تو اس کا کوئی قاعدہ نہیں ہوتا، وہ انفرادی قانون ہوتا ہے۔ کوئی شخص اپنی محبت کا اظہار کسی کے سر کو چومنے سے کرتا ہے، کوئی اس کے ہاتھ کو چومنے سے اور کوئی قدموں کو چومنے سے کرتا ہے۔ یہ ہر شخص کی انفرادی چیز ہے، اور میری رائے میں ان انفرادی معاملات میں ہمیں دخل نہیں دینا چاہئیے۔ ہاں ممنوع چیزیں مثلاً غیر اللہ کو سجدہ کریں، ایسا نہ ہونا چاہئیے۔

سوال ۲۰:- رفع الیدین جائز ہے یا نہیں؟

جواب: اس کا جواب بہت آسان ہے۔ اس بارے میں آئمہ میں اختلاف ہے، جس کی اساس یہ معلوم ہوتی ہے کہ رسول اکرم ﷺ نے کبھی یوں فرمایا اور کبھی یوں فرمایا، لہٰذا دونوں سنت نبوی ہیں۔ اور جیسا کہ میں نے عرض کیا تھا، اپنے بچپن کا ایک واقعہ، کہ میں چھ سات برس کا تھا، صدر مدرس ہماری کلاس میں آئے اور یہ معلوم کیا کہ یہ ہندو ہے یا مسلمان، شیعہ ہے یا سنی، حنفی ہے یا شافعی وغیرہ۔ پھر وہ ہم مسلمان طلبہ سے مخاطب ہو کر کہنے لگے، بچو! مذہب (مسلک) کے فرق کی بنا پر آپس میں کبھی نہ جھگڑو۔ ہر مذہب کا شخص اپنے امام کے بتائے ہوئے احکام کے مطابق عمل کرتا ہے اور انہوں نے ایک جملہ کہا جو میں باوجود ساٹھ سال سے زیادہ عرصہ گزر جانے کے اب تک نہیں بھول سکا۔ وہ جملہ یہ تھا کہ اللہ کو اپنے حبیب رسولِ اکرم ﷺ سے اتنی محبت تھی کہ ان کے ہر عمل، ان کی ہر حرکت کو قیامت تک باقی رکھوانا چاہتا تھا۔ اگر رسول اللہ ﷺ کی صرف ایک حرکت پر سب مسلمان عمل کریں تو اسی رسول کی ایک دوسری حرکت غائب ہو جائے گی۔ لہٰذا خدا نے اپنے حبیبؐ کی ہر ہر حرکت کو محفوظ رکھنے کے لیے مختلف آئمہ، مختلف مذاہب کے ذریعے اس کی بقا کا انتظام کیا۔ کبھی یہ نا سمجھنا کہ وہ رسول اللہ ﷺ کے احکام کے خلاف ہے۔ وہ بھی اللہ کے رسول ﷺ کا عمل ہے اور یہ بھی رسول اللہ ﷺ کا عمل ہے۔